اردو کے اسالیب بیان

از

ڈاکٹر سید محی الدین قادری

ام۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ لنڈن

پروفیسر زبان اردو کلیۂ جامعۂ عثمانیہ

سنہ ۱۹۳۲ء

مطبوعۂ

احمدیہ پریس چارمینار حیدرآباد دکن

قیمت [illegible]

Aurang Zeb Qasmi
Subject Specialist
GHSS Qasmi Maradn.
szlibrary.WordPress.com

فہرست

۱ دیباچہ ترتیب ثانی ۱۱

۲ دیباچہ ترتیب اول ۱۳

۳ اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے ۱۵

۴ دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشو و نما ۲۹

۵ شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل ۳۳

۶ فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں ۳۹

۷ غدر اور اس کے قریبی زمانہ میں نثر کی حالت ۴۹

۸ سرسید کی کوششوں کا اثر ۵۵

۹ موجودہ انشا پردازوں کی نثر اور اس کے اسالیب ۶۹

۱۰ اردو نثر کے رجحانات ۱۱۹

۱۱ اردو نثر کا مستقبل ۱۳۵

تفصیلی فہرست مضامین

باب اول

اُردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے

اردو نثر کی ابتدا، دور اول اور مذہبی مباحث، شیخ عین الدین گنج العلم کے رسائل خواجہ بندہ نواز کی معراج العاشقین اور گل باس اس دور کی زبان کی خصوصیت نثر کے نمونے ۲۵

باب دوم

دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشوونما

احکام الصلوٰۃ، سب رس، شمائل الاتقیا معرفت السلوک سید شاہ محمد قادری کے اسرار توحید، تصنیفات مولانا باقر آگاہ اس دور کی زبان کی خصوصیتیں نثر کے چند نمونے ۲۹

باب سوم

شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل

فضلی کی دہ مجلس، نثر شعلہ عشق، دیباچہ کلیات سودا، تصنیفات محمد حسین کلیم تحسین کا نوطرز مرصع، شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ قرآن مجید، انشا کی دریائے لطافت، اس دور کی نثر کے متعلق شاد عظیم آبادی کا خیال، نثر کی خصوصیتیں۔

باب چہارم

فورٹ ولیم کالج کی نثری کوششیں

ڈاکٹر گلکرسٹ اردو کے ایک بڑے محسن، کلکتہ کے انشا پرداز اور ان کی تصنیفات، میر امن کی باغ و بہار کے اسلوب کی خصوصیت اور اس کے نمونے، حیدری کی طوطا کہانی کی طرز تحریر اور اس کے نمونے، افسوس کی باغ اردو کا اسلوب اور اس کے نمونے، ترجمہ اخلاق جلالی کا اسلوب اور اسکے نمونے، تذکرہ گلشن ہند کی طرز تحریر اور اس کے نمونے، اس دور پر ایک سرسری نظر اسکی خصوصیات (۳۹)

باب پنجم

کلکتہ کی ادبی فتوحات کا اثر، اس زمانہ میں لکھنو اور دہلی کا ادبی مذاق، غیر مقلدوں کی مذہبی تحریکات سے اردو کا فائدہ، مرزا غالب کی اردو خدمات اور انکی نثر کی خصوصیات، اس دور کے متعلق آزاد کی رائے (۴۹)

باب ششم

سرسید کی کوششوں کا اثر

اردو کا رواج سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں، مدارس کیلئے اردو نصابی کتابوں کی ضرورت، اس دور میں زبان کے ارتقا کی نوعیت، اردو دنیا اور چھاپہ خانے، اخباروں کی آزادی اور اردو کے پہلے اخبار، سرسید کی ابتدائی اردو خدمات، آثار الصنادید اور اس دور کا عام مذاق، سائنٹفک سوسائٹی، غازی پور، اس انجمن کا اخبار، رسالہ تہذیب الاخلاق، پہلے پرچہ کی تمہید کی چند سطریں، تہذیب الاخلاق کا اثر اردو پر، اس پرچہ کی زندگی کے حالات، سرسید کی نثر کی خصوصیات۔ خان بہادر منشی ذکاء اللہ دہلوی کے اسلوب بیان کی خصوصیت اور اسکا نمونہ

شمس العلماء سید الطاف حسین حالی کی نثر اور اس کے نمونے، شمس العلماء ڈاکٹر حافظ نذیر احمد ال ال ڈی کی نثر اور اس کے نمونے، شمس العلماء علامہ شبلی کی نثر اور اس کے نمونے، نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک کی نثری خدمات .... (۵۵)

باب ہفتم

موجودہ انشاپردازوں کی نثر اور اس کے اسالیب

مولانا عبد الحلیم شرر کی نثر اور اس کے نمونے، پنڈت رتن ناتھ سرشار کی طرز تحریر اور اس کے نمونے ڈاکٹر مرزا محمد ہادی رسوا کی اردو نثر اور اس کے نمونے، مصور غم مولانا راشد الخیری کی نثر کی خصوصیات اور نمونے، مصور فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی کی نثر کا اسلوب اور اس کے نمونے، مہدی حسن افادی الاقتصادی کی طرز تحریر اور اس کے نمونے، بیسویں صدی اور اردو علم و ادب، مخزن، دکن ریویو، حسن، ادیب، العصر، دلگداز، ذخیرہ، زمانہ۔ شیخ عبد القادر، ظفر علی خان، عزیز مرزا، سجاد حیدر یلدرم، سلطان حیدر جوش، سید محمد فاروق شاہجہان پوری، احسن مارہروی، سجاد مرزا بیگ دہلوی، محمد عبد الرؤف عشرت، ممتاز علی، شوکت میرٹھی، سلطان احمد، عنایت اللہ، دیا نرائن نگم، برج نراین چکبست، پیارے لال شاکر، پریم چند اور سدرشن کی نثری خدمات ابو الکلام آزاد کے اسلوب کی خصوصیات اور نمونے، نیاز فتحپوری کی طرز تحریر اور اس کے نمونے، عبد اللہ العمادی، تاجور نجیب آبادی، عبد الماجد کی نثر اور اس کے نمونے، علی حیدر طباطبائی، اسلم جیراجپوری کی نثر کے نمونے، سید سلیمان ندوی، محمد عبد السلام ندوی اور حبیب الرحمن خان شروانی کی طرز تحریر اور اس کے نمونے، انجمن ترقی اردو کے کارکنوں کی طرز تحریر، عبد الحق اور وحید الدین سلیم کے اسالیب کی خصوصیات اور ان کے نمونے (۷۹)

باب ہشتم

اردو نثر کے رجحانات

۱۔ فارسیت کا گہرا اثر اور اردو میں تکلف، تصنع اور تعقید کا رواج۔

۲۔ مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑوں اور ان کے بعد سرسید کی کوششوں کا اثر اور اردو میں سادگی اور بے تکلفی کی ابتداء

۳ اردو نثر کے دو مختلف دبستانوں یعنی دہلی اور لکھنو کے باہمی اختلافات

۴ انگریزی کا اثر اردو طرز تحریر پر

۵ اہلال کا جاری ہونا اور عربی و فارسی الفاظ کی اردو میں فراوانی
اس رجحان کا رد عمل ہندوؤں کی طرف سے اور اردو میں ہندی اور سنسکرت الفاظ کی کثرت استعمال۔

۶ انجمن ترقی اردو اور دار الترجمہ جامعہ عثمانیہ میں جدید اصطلاح سازی کے طریقے۔

۷ رابندر ناتھ ٹیگور کی نظموں کے ترجمے اور اردو نثر میں لطیف نگاری

۸ ظرافت نگاری۔ ظفر علی خان۔ ملا رموزی، رشید احمد صدیقی اور عظمت اللہ خان کی نثر کی نوعیت اور اس کے نمونے۔

باب نہم

اردو کا مستقبل

انشا پردازی کی اصلی خوبیاں، زبان فن لطیف کی حیثیت سے معانی الفاظ اور اصوات الفاظ کی ہم آہنگی، ادبی تحریر اور عام علمی تحریر کا فرق، اسلوب کی انفرادیت، اصلیت اسلوب کا اساسی اصول ہے۔ طرز تحریر اور مصنف کی ذات غیر معمولی انشا پردازوں کا اثر زبان پر اسلوب بیان اور مصنف کا ماحول نثر اور نظم کا فرق، نثر کے معیار حسن و قبح، مد و جزر، لفظوں، جملوں، اور عبارتوں کے مطالب علیحدہ علیحدہ اور معین ہوں۔ ترتیب الفاظ کی اہمیت، اسلوب کے ذریعہ سے قاری کا کسی خاص ذہنی یا وجدانی فضا میں منتقل ہو جانا، موضوع کی فطرت اور اس کے اظہار کا پیرایہ، اردو کی موجودہ محدودیت اس کی رفتار ترقی کے لئے مضر ہے۔ آغا حیدر حسن کی طرز تحریر کے نمونے اور اردو کی ہمہ گیری پر ان کا اثر۔ کسی خاص شہر یا خاص محلہ کی بولی عام اردو کی زباندانی کا معیار ہرگز نہیں ہو سکتی، ہر شہر اور ہر ملک کے باشندوں کو اپنی اپنی بولیوں کے مخصوص اور خوبصورت الفاظ اور محاورے وغیرہ اپنی تحریروں میں بے تکلفی اور آزادی کے ساتھ استعمال کرنا چاہیئے، اکثر دکنی الفاظ اور محاورے اس قابل ہیں کہ عام اردو تحریر میں رواج پائیں، ٹھیٹ زبان کی خوبی اور وسعت، ادبی تصنیف میں تناسب اور تناقص کا لحاظ، بہترین انشا پردازی کے چند اور اسرار۔

دیباچہ ترتیب ثانی

اردو نثر کے اسالیب جیسے موضوع پر روشنی ڈالنے کے لئے میں نے اس کتاب میں جو طریقہ کار اختیار کیا ہے اس کا شخصی اور طرفدارانہ ہونا ضروری تھا۔ اگرچہ میں نے اس خیال کو مدنظر رکھنے کی کوشش کی ہے کہ اس کے پڑھنے والے اردو ادب اور انشا پردازوں سے روشناس ہو سکیں۔ اور صحیح و سنجیدہ ذوق ادب کی فضا اردو زبان میں وسیع تر ہو سکے۔ مگر اس فرض کی انجام دہی کے وقت میں ضرور محسوس کرتا رہا کہ جس اسلوب یا خصوصیت کو میں بہتر اور مفید سمجھتا ہوں ممکن ہے لوگ اس کو کچھ اور سمجھیں ۔

موجودہ انشا پردازوں کے اسلوب پر بحث کرتے وقت اکثر جگہ یہ دقت رونما ہوتی تھی کہ کیا نہ لکھا جائے اور اب بھی میں بدقت کہہ سکتا ہوں

کہ اس میں کامیاب رہا ہوں۔ مختلف انشا پردازوں کے اسلوب کے نمونوں کے طور پر میں نے جو اقتباسات دئیے ہیں شاید خود انشا پرداز انہیں پسند نہ کریں۔ اور اگر انہیں اختیار ہوتا تو غالباً کوئی اور ٹکڑا وہ پیش کرتے۔ مگر مجھے کم از کم یہ اطمینان ضرور حاصل ہے کہ میں نے حتی الوسع صحت مذاق کا خیال رکھا ہے میں سمجھتا ہوں کہ میں اپنے مقصد میں ناکام نہیں رہا۔ اور میرا زاویۂ نگاہ نامقبول نہیں ہوا جب میں دیکھتا ہوں کہ یہ کتاب ایک دفعہ چھپکر ختم ہو چکی اور اور شاید میں اس عجلت کے ساتھ اس پر نظر ثانی کرنے کے لئے مجبور نہ کیا جاتا اگر یہ نصاب میں نہ شامل ہوتی اور اس کے بیسیوں مطلوبے ملک کے مشہور کتب فروش مکتبۂ ابراہیمیہ میں جمع نہ ہو جاتے۔

اس دوسری اشاعت کے وقت مجھے کوئی خاص بات کہنی نہیں ہے میں نے کتاب میں کوئی اہم تبدیلی نہیں کی۔ اگرچہ نظر ثانی کرتے وقت میں بعض جگہ اس کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔

بعض انشا پردازوں کے اسلوب اور انشا پردازی کی قدر و قیمت کی نسبت میرے خیالات میں کچھ تبدیلی ضرور ہوئی ہے۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کے مطابق کتاب کی عبارت میں تغیر و تبدل کرنا لازمی نہیں ہے البتہ جہاں جہاں کوئی عبارت یا خیال بھونڈا یا ناگوار ہو گیا تھا میں نے تبدیلی کر دی ہے۔

سید محی الدین قادری

[illegible] رمضان سنہ ۱۳۵۱ھ

Aurang Zeb Qasmi
Subject Specialist
GHSS Qasmi Maradn.
szlibrary.WordPress.com

دیباچہ ترتیب اول

دنیا کی سبق آموز نیرنگیاں، گوناگوں حالات اور بوقلموں حادثات کا طلسم خانہ ہیں۔ گویا دنیا ایک تماشہ گاہ ہے، جس میں ہر وقت عجیب و غریب اور نت نئے واقعات پیش نظر ہوا کرتے ہیں اور جس کے پردے ہر لمحہ اٹھتے ہیں اور ایک نیا تماشہ دکھاتے ہیں۔

ایک طرف سلطنت مغلیہ کا شیرازہ کسی کے زلفوں کی طرح بکھرتا ہوا نظر آتا ہے تو دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اردو دنیائے علم و ادب میں گرمی محفل کا پیغام لاتی ہے۔ غدر کے پر آشوب زمانہ میں جب دلی ایک دفعہ پھر اجڑتی ہے اور قلعہ معلی سے سطوت اسلامی کا جنازہ اٹھ کر یہ شعر زبان زد خاص و عام کرتا ہے کہ ؎

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے باد صبا
یادگار رونق محفل تھی پروانے کی خاک

ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نوخیز اردو سرستان علم و ادب کے لیے ناؤ نوش بلند کرتے ہوئے اور ع

چمن میں ہیں خزاں کے بعد لیکر پھر بہار آئی

کا نغمہ پر ترنم گاتے ہوئے داخل ہوتی ہے ۔

ہندوستان کے اسی عہد محشر نما میں جس پر بقول غالب "رستخیز بے جا" کا اطلاق مناسب معلوم ہوتا ہے، چند برگزیدہ ہستیاں معرض وجود میں آتی ہیں ۔ مرزا نوشہ، سرسید، ذکاء اللہ، نذیر احمد، آزاد ۔ حالی، شبلی، اور محسن الملک نہ صرف مسلمانوں کے لئے پیغام امید ...... بنتے ہیں ۔ بلکہ نونہال اردو کو بارآور کر کے سرفلک کرنے کا بیڑا اٹھاتے ہیں اور اپنی آبیاریوں کے ذریعے سے اردو کا نثر میں بھی وہ رتبہ بڑھاتے ہیں کہ پایان کار اردو نثر اردو نظم پر سبقت لے جانے کے قابل بن جاتی ہے ۔

اردو زبان میں نثر نظم کے بہت بعد لکھی جانی شروع ہوئی تھی جس طرح ولی اورنگ آبادی کے دیوان نے عام طور پر اردو نظم کی اساسی تحریک پیدا کی کلکتہ کے فورٹ ولیم کالج نے اردو نثر کی نشو و نما اور اشاعت کا کام کیا ۔ اس سے قبل اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو نثر

کا دکن میں معتدبہ اور شمالی ہند میں مختصر سا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا۔ لیکن اسوقت تک جو کچھ لکھا گیا تھا وہ ایسا نہ تھا کہ کسی زبان کو دنیا کی تہذیب یافتہ اور شایستہ زبانوں کے ہمسر بنا سکے۔

اردو فورٹ ولیم کالج اور اس کے بعد سرسید احمد خان کی کوششوں کے باعث اس اثناء میں اپنی رفتار ارتقاء کے جن عبوری دوروں سے گذر کر موجودہ حالت تک پہونچی ہے ان کا اقتضا ہی یہ تھا کہ اس کی نثر اس قابل ہو جاتی کہ اس کو جلد سے جلد متفرق علوم و فنون کا سرمایہ دار بنایا جائے اور اس درجہ تک پہونچنے کے بعد وہ فطرتاً ایک ایسے مرکز کی محتاج تھی جہاں اس کی ہر قسم کی ترقیاں پوری طرح ظاہر ہوسکتیں کیونکہ اگرچہ اس نے ایک وسعت ضرور حاصل کر لی ہے۔ اور اس میں ہمہ گیری کی صلاحیت بھی پیدا ہو گئی ہے تاہم اس کی نثر نے ابھی وہ رتبہ نہیں حاصل کیا جو ایک مہذب اور علمی زبان کو حاصل ہوتا ہے۔ اس وقت اس امر کی سخت ضرورت تھی کہ جہاں اس کو مطالب و معانی کے لحاظ سے مالدار بنایا جائے، اس کے اسلوب بیان کی نگہداشت کی طرف بھی خاصی توجہ کی جائے۔

یہ نہایت خوش آیند امر ہے کہ وہ نونہال جس کا ابتدائی گہوارہ دکن تھا۔ دہلی، لکھنو، کلکتہ، اور پنجاب میں نشو و نما پاتے رہنے کے

بعد معراج کمال حاصل کرنے کے لئے پھر دکن کے آغوش میں آگیا ہے۔ اور زیادہ تر خوشی تو اس بات کی ہے کہ اس وقت دکن بھی اس مرتبہ کو پہنچ گیا ہے کہ دل کھولکر اپنے گمشدہ نونہال کی آؤ بھگت کر سکے اور ایسے ذریعے اختیار کرے جن سے وہ بہت جلد معراج کمال حاصل کر سکتا ہے۔

دو سال کا عرصہ ہوا جب میں نے امتحان بی۔ اے اور اس کے بعد روح تنقید کی طباعت و اشاعت سے فراغت حاصل کی، میرے کلیہ کے قابل فخر صدر اور میرے محترم شفیق عالیجناب مولوی محمد عبدالرحمن خاں صاحب اے، آر، سی، اس، بی، اس، سی (لندن) فیلو آف دی فزیکل سوسائٹی (لندن) نے مجھے اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ ہر زبان کے ادب میں اسلوب بیان کو خاص اہمیت حاصل ہوتی ہے اور چونکہ اردو کی طرز تحریر ابھی اس قابل نہیں ہوئی ہے کہ اس کو دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے مقابلہ میں رکھ سکیں اس لئے مجھے چاہیئے کہ اردو کی طرز تحریر کی (ابتدائے اردو سے لیکر موجودہ زمانہ کے اسالیب تک کی) نوعیت کا مطالعہ کرنے اور ترقی یافتہ زبانوں میں اسالیب کے محاسن و قبائح کے متعلق جو خیالات ظاہر کئے گئے ہیں ان سے بھی واقفیت حاصل کرنے کے بعد اردو اسالیب کی نوعیت اور ان کے مستقبل کے متعلق ایک مضمون لکھوں۔ چنانچہ میں نے اس کام کو شروع

کر دیا احسان فراموشی ہوگی ۔ اگر میں اس امر کا اظہار نہ کروں کہ اس بارے میں جناب صدر صاحب نے مجھے موقع بموقع اپنے مفید مشوروں سے کافی مدد پہونچائی ۔ اگر آپ کا ادبی ذوق اس کام میں میری امداد نہ کرتا رہتا تو میں اس قدر آسانی کے ساتھ اس ادبی کوشش کو اختتام تک نہ پہونچا سکتا جو آج سے ایک سال قبل ہی رسالہ سہیل علی گڈھ میں بااقساط شایع ہوتی رہی اور اب کتابی شکل میں آپ کے روبرو ہے ۔

اس کتاب کو جس کے ذریعہ سے میں نے اسلوب بیان کے لحاظ سے اردو نثر کی ارتقائی منزلوں پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے در اصل فورٹ ولیم کالج کی اردو تصنیفات اور سرسید کی کوششوں کے اثر سے اردو کے اسالیب بیان میں جو انقلاب پیدا ہوا صرف اسی کے اظہار سے شروع ہونا چاہیئے تھا ۔ مگر ان تمام کی اہمیت نمایاں کرنے کے لئے ضروری تھا کہ اس انقلاب سے قبل اردو نثر کن حالتوں سے نکلی تھی اور کس درجہ تک پہونچ چکی تھی اس کا بھی اندازہ لگایا جاتا ۔ ان امور کے مدنظر میں نے اس موضوع کو نو فصلوں میں تقسیم کیا ہے ۔ جن کی تفصیل فہرست مضامین غالباً آپ نے ملاحظہ کی ہوگی ۔

اردو نثر کو میں نے جن دوروں میں تقسیم کیا ہے ۔ ان کے سلسلہ میں دو امور کا اظہار ضروری ہے ۔ پہلا یہ کہ یہ دور صرف اردو اسالیب کے

مد نظر قایم کئے گئے ہیں کیونکہ کسی زبان کی تاریخ کو متفرق نقاط نظر کے لحاظ سے متفرق اور مختلف دوروں میں تقسیم کرنے کی ضرورت پڑتی ہے اور دوسرا یہ کہ تاریخ اردو کے مواد کی حالت اس وقت تک اس قدر ناقابل تشفی ہے کہ اردو زبان اور ادب کے دوروں کے متعلق صحیح طور پر کوئی خاص حدود معین نہیں کئے جا سکتے۔ بہت ممکن ہے اس کے متعلق آیندہ ایسی تحقیقات ہو سکیں جن کے بعد اسلوب کے لحاظ سے بھی میرے قایم کردہ دور خود مجھی کو ناقص نظر آئیں۔ بحالت موجودہ میں نے اس امر کی کوشش کی ہے کہ حتی الامکان صحت منازل کا لحاظ رہے

اردو کے گزشتہ اور موجودہ انشا پردازوں کے متعلق میں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ قطعاً میرے ذاتی مذاق اور مطالعہ پر مبنی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ بعض حضرات کے نقطہ نظر سے کسی کے متعلق رائے دینے کے باعث مجھ سے ناانصافی سرزد ہوئی ہو۔ لیکن میں بحالت موجودہ اپنے ذوق ادب اور بساط مطالعہ سے مجبور ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ خود میں آگے چل کر کسی کی ادبی قوتوں کے متعلق اپنی رائے بدلدوں

اگر واقعی کسی انشا پرداز کے متعلق میں نے کوئی ناقص خیال ظاہر کیا ہے۔ تو میں اس امر کے اقرار پر مجبور ہوں کہ ناظرین خود اس انشا پرداز کی تصنیفات کا مطالعہ کر کے اس کے اسلوب کے متعلق

رائے قایم کریں کیونکہ مجھے اپنے مطالعہ پر اس قدر فخر نہیں ہے کہ میں اپنی ذاتی رائے کی وجہ سے کسی کی انشا پردازی کی خوبیوں کو نقصان پہونچاؤں مگر اس موقعہ پر میں اس حقیقت حال کو بالکل بے نقاب کر دینا چاہتا ہوں کہ میری رایوں میں کسی قسم کے تعصب کا کوئی دخل نہیں ہے میں اس کتاب کو پیش کرتے ہوئے اگر کسی چیز کا فخر کر سکتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ میں نے ایک بے لوث ادبی خدمت کی ہے۔ کیونکہ موجودہ انشا پردازوں میں بعض ایسے بھی ہیں جن سے میرے ذاتی تعلقات نہایت خوشگوار ہیں لیکن میں نے ان کی طرز تحریر کے بیان میں کوئی طرفداری نہیں ظاہر کی۔ اس کے برخلاف بعض حضرات ایسے بھی ہیں جن کے کارناموں کی نوعیت مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں انہیں اردو ادب کا نہ صرف ایک بیکار بلکہ مضر عنصر سمجھوں۔ لیکن جہاں تک ان کے اسلوب بیان کا تعلق ہے میں نے دل کھول کر ان کی خوبیوں کی داد دی ہے۔

یہاں یہ امر بھی مخفی نہ رہنا چاہیئے کہ میرے یہ تمام خیالات صرف اسالیب بیان کی حد تک منحصر ہیں۔ کتاب میں جن انشا پردازوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کے کارناموں کے مطالب و معانی اور موضوعوں کے لحاظ سے ان پر کہیں روشنی ڈالنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اگر کہیں

ان امور کا ذکر کیا بھی گیا ہے۔ تو وہ عمداً نہیں بلکہ محض اس لئے کہ ان کے اظہار کے بغیر اسالیب کے متعلق کوئی صحیح رائے نہیں دی جاسکتی تھی یہ بہت ممکن ہے اور ممکن کیا واقعہ ہے کہ اگر انہی انشا پردازوں پر میں بھی کسی دوسرے نقطہ نظر سے بحث کروں تو اکثر موقعوں پر اس قسم کے خیالات سے اختلاف کر جاؤں جو اس وقت اسلوب کے متعلق ظاہر کیے گئے ہیں۔

انشا پردازوں کے انتخاب کے بارے میں بھی میں اپنے مذاق اور مطالعہ کا زیادہ مرہون منت ہوں۔ یہ ممکن ہے کہ بعض ایسے انشا پردازوں کا میں نے ذکر نہیں کیا ہو جن کا اس سلسلہ میں نام آنا ضروری تھا۔ لیکن غالباً میں معاف کیا جاؤں گا۔ اگر اس امر کا اعتراف کر لوں کہ میرے "داماں ذوق ادب" میں فی الحال "انہی گلہائے انشا پردازی" کی وسعت تھی یا اگر میں غالب کے اس شعر:۔

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

کو مدنظر رکھوں تو یہ معذرت بھی کر سکتا ہوں کہ میرے موجودہ مطالعہ کی چادر صرف انہی انشا پردازوں کے شہ کاروں کے لئے کافی ہوسکتی ہے

دیباچہ کو ختم کرنے سے پہلے شاید اس امر کا اظہار بھی ضروری ہے کہ

اس کتاب کے تقریبًا پورے اجزا رسالہ جات سہیل جلد اول نمبرات دوم و سوم بابت ماہ اپریل و جولائی سنہ ۱۹۲۶ء میں شایع ہو چکے ہیں اس وقت اگرچہ میں نے ان پر سرسری طرح سے نظرثانی کی ہے۔ لیکن سوائے چند انشاپردازوں کی طرز تحریر کے نمونے پیش کرنے کے زیادہ تغیر و تبدل نہیں کر سکا حالانکہ بعض حضرات کے خیال میں ایک دو جگہ اس کی ضرورت بھی تھی۔

اس اثناء میں بعض محترم کرم فرماؤں نے مجھے اس امر کی رائے دی کہ میں اس کتاب میں مصنفین کے حالات اور اردو زبان کے بعض دیگر شعبوں کے متعلق معلومات کو داخل کر کے ایک تاریخ ادب اردو کی حیثیت سے اسے شایع کروں لیکن میں باادب التماس کرنے کی جرأت کرتا ہوں کہ ایسی صورت میں کتاب کے اندر جس قدر اتیج سے کام لیا گیا ہے وہ بالکل ملیامیٹ ہو جاتا۔ اور اگرچہ یہ اس وقت بھی اردو انشا پردازوں پر ایک طالب علمانہ نظر ہے تاہم اتنا ضرور ہے کہ اردو انشا پردازی کا جو کچھ مطالعہ کیا گیا ہے ایک حقیقی طالب علم کے زاویۂ نگاہ سے کیا گیا ہے اور اس کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے وہ ایک حقیقی طالب علم کے پرخلوص اور صداقت آمیز خیالات کی ترجمانی ہے نہ کہ کسی ایسے ادیب کی مطالب آمیز تحریر جو کسی نہ کسی دبستان یا

طبقہ مصنفین کا طرف دار ہو اور اس وجہ سے اگر عمداً نہیں تو کم از کم غیر ارادی طور پر ہی اپنے دوستوں اور طرف داروں کی مدافعت یا ستائیش کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے

میں آخر میں ان عنایت فرماؤں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میری اس ادبی کوشش کو پسند فرما کر نہ صرف میری ہمت افزائی کی بلکہ مجھے اس امر کی رائے دی کہ میں جلد سے جلد اسے کتاب کی صورت میں شایع کروں ۔

ابوالحسنات سید غلام مُحی الدین قادری

شاہ گنج حیدرآباد دکن
۱۱ محرم ۱۳۴۶ھ

اُردو

کے

اسالیبِ بیان

(۱)

اردو زبان میں نثر کے ابتدائی کارنامے

اردو نثر کی ابتدا کے متعلق ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ بعض تحقیقات نے شیخ عین الدین گنج العلم کے رسالوں کو اردو کی قدیم ترین مصنفات قرار دیا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ خیال بھی بالکل غلط ثابت ہو۔ کیونکہ شیخ عین الدین سنہ ۷۰۶ھ میں پیدا ہوئے تھے اور اب بعض کتابیں ایسی بھی دستیاب ہو رہی ہیں جو سنہ ۸۰۵ھ کے قریبی زمانہ میں لکھی گئی تھیں۔

نثر اردو کی ابتدا خواہ کسی زمانہ سے کیوں نہ قرار دیجائے اس امر کو ماننا پڑیگا کہ دکن میں اس کی بنا تعلیم و تبلیغ ہی کی خاطر ڈالی گئی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دسویں صدی ہجری سے قبل کے اکثر کارنامے مذہبی مباحث ہی پر مبنی ہیں۔ شیخ عین الدین گنج العلم کے جو رسالے سینٹ جارج کالج کے کتب خانہ میں پائے گئے [illegible] متعلقہ [illegible] مسائل

لکھے گئے تھے۔

بزرگان دین کے لئے ضروری تھا کہ اپنے مریدوں اور نومسلموں کے تزکیۂ نفس اور تعلیم کی خاطر مذہبی مسائل کو عام فہم کر دیتے۔ جس کا سر انجام پانا مقامی بولیوں میں تحریر و تقریر سے کام لئے بغیر ناممکن تھا۔ چنانچہ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اردو میں سب سے پہلے مذہبی الفاظ کا ایک اچھا خاصہ ذخیرہ جمع ہو گیا زبان ایک سائنٹفک یا مصنوعی شے ہرگز نہیں۔ وہ خود بخود بنتی اور بگڑتی رہتی ہے اہل زبان جس قسم کے خیالات میں محو رہتے ہیں اسی کے موافق ان کی زبان بھی تیار ہوتی جاتی ہو۔ لہذا جب کوئی قوم مذہب کی طرف زیادہ راغب ہو تو ضروری ہے کہ اس کی زبان بھی بالکل مذہبی ہو جائے۔

نثر اردو کی دور اول کی اکثر کتابیں مذہبی مباحث پر مبنی ہیں اس لئے ان کی عبارتیں بھی مذہبی اصطلاحات سے مملو ہیں۔ غالباً یہی وہ زمانہ ہے جب کہ ریختہ میں وہ کثیر التعداد الفاظ جو آج اردو زبان میں مذہب و تصوف کی اصطلاحات بنے ہوئے ہیں بالکل پہلی مرتبہ استعمال کئے گئے۔ اور مراقبہ۔ مشاہدہ۔ کشف۔ الہام۔ کرامات۔ سفلی۔ علوی۔ ملکوت۔ جبروت ناسوت، میثاق، محشر، شریعت، طریقت، معرفت، حقیقت، وحدانیت سالک، عارف، پیر کامل، مرید صادق، واجب الوجود اور ممکن الوجود جیسے [illegible] الفاظ جو آج عام طور پر [illegible] سمجھے جاتے

ہیں، غالباً اسی وقت اختیار کیے گئے ہیں۔

اس زمانہ کی تصانیف میں گنج العلم کے رسالوں کے علاوہ حضرت خواجہ بندہ نوازؒ کی "معراج العاشقین" اور "ہدایت نامہ" ان کے نبیرہ سید محمد عبداللہ حسینی کا ترجمہ "نشاط العشق" (مصنفہ حضرت محبوب سبحانی رحمتہ اللہ علیہ اور میران جی شمس العشاق کی "جل ترنگ" اور "گل باس" زیادہ قابل ذکر ہیں اگرچہ یہ اردو نثر کی بالکل پہلی کوششیں ہیں لیکن ان میں زبان حتی الوسع سادہ اور صاف استعمال کی گئی ہے۔ عوام کی تلقین اور ہدایت ان کتابوں کا مقصد تھا اور اسی لیے ان کے مصنفین کا فرض تھا کہ وہ تعقید اور تصنع سے حتی الامکان پرہیز کرتے تاہم اولین کوششیں ہونے کی بنا پر بعض بعض عبارتوں میں گنجلک پایا جاتا ہے۔ اس زمانہ کی نثر کے اسلوب بیان کا اندازہ حسب ذیل عبارتوں سے کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) نبی کہے تحقیق خدا کے درمیان تے ستر ہزار پردے اوجیالے کے ہور اندھیار کے اگر اس میں تے یک پردہ اٹھیا وے تو اس کی آنچ تے میں جلوں۔ ہور ایک وقت ایسا ہوتا ہے سمجھو اور دیکھو۔ بے پرواہ۔ اندھارے کے اوجیالے کے عارفاں پر ہے واصلاں پر پردے نورانی۔ وے واصلاں کا صفا پردا ہوتا ہے۔ محمدؐ کا اقتدا اے عزیزاں ربوبیت کا پردہ سوائے تن جالی جسم کے پردے کوں اپڑے باج اس جمال الوہیت کے پردے

ممکن الوجود کون پانڑسکے"۔ معراج العاشقین مطبوعۂ تاج پریس حیدرآباد صفحہ ۱۲)

(۲) اے عزیز مرید صادق - اچھے پیر کے سواکوں امر خدا ہو - رسول پیدا کیا ہے اپنے بوج کوں - محمدؐ کون یہی ہے نصیحت کرنے کوں - اسبات میں امام جعفر صادق خوب فرمائے ہیں پیر کوں درکار ہے - دس چیز سمجھنا سو اس پیر فرض ہوتا ہے - اول علم اکی دانائی کا بوج کا دویم سخاوت اچھی دل کا سویم عمل اچھی دانائی کا چہارم مرید کے مال سوں طمع نا کرنا حرص کا پنجم تا داہی کی بات نا کرے مریداں میں ششم عقل اچھی ہفتم شجاعت اچھی ہشتم یاد میں رہنا - نہم حال پر حال ہوے ہو - دہم سو بوجھ کا مالک ہونا ...... (معراج العاشقین عبارت خاتمہ)

(۲)

دسویں صدی ہجری کے بعد دکن میں نثر کی نشو ونما

اردو نثر کے دور دوم میں اسلوب کے لحاظ سے حسب ذیل کتابیں خصوصیت رکھتی ہیں۔

(۱) مولانا عبداللہ کی احکام الصلوٰۃ جو ۱۰۳۲ھ میں لکھی گئی ہے اور جس میں نماز کے متعلقات بیان کئے گئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مصنف نے فارسی سے ترجمہ کیا ہے [1]

(۲) وجہی کی "سب رس" ۱۰۴۵ھ میں ملا وجہی نے غالباً وجیہ الدین گجراتی کی کتاب سے ترجمہ کیا ہے یہ کتاب ادبی حیثیت سے بھی اہم ہے

(۳) شمائل الاتقیاء ۱۰۸۰ھ میں میراں یعقوب نے حضرت برہان الدین اولیاء رح (اورنگ آبادی) کی کتاب سے ترجمہ کیا ہے۔ یہ بھی متذکرہ بالا کتابوں کی طرح تصوف میں ہے۔

---

[1] دیکھو۔ "دکن میں اردو" طبع اول صفحہ (۱۵)

(۴) "معرفت السلوک" تقریباً سنہ ۱۱۰۰ھ کے اوائل میں لکھی گئی۔[1] معلوم ہوتا ہے شاہ ولی اللہ صاحب قادری نے اپنے والد کی ایما پر فارسی سے ترجمہ کیا ہے۔

(۵) ان کے علاوہ سید شاہ محمد قادری نے جو عالمگیر کے زمانہ میں گذرے ہیں بعض رسالے تصوف میں تصنیف کئے۔

(۶) سید شاہ محمد قادری ہی کے قریب ہی زمانہ میں سید شاہ میر نے ایک رسالہ توحید کی نسبت لکھا جس کا نام "اسرار التوحید" ہے۔[2]

(۷) اس دور کی آخری تصانیف مولانا باقر آگاہ (المتوفی سنہ ۱۲۲۰ھ) کی ہیں جو غالباً جدید اسالیب بیان اور قدیم طرز انشا پردازی کی درمیانی کڑیاں ہیں یہی وہ شخص ہیں جنھوں نے سب سے پہلے اردو نثر میں علمی مباحث پر قلم اٹھایا۔ اس دور میں گو زبان نے زیادہ ترقی نہیں کی۔ یائے معروف و یائے مجہول اور تذکیر و تانیث میں اس وقت بھی پہلے دور کے مانند کوئی فرق نہیں کیا جاتا تھا۔ تاہم اس عرصہ میں اردو زبان کے لفظی خزانے میں کافی اضافہ ہو گیا تھا۔ مذہب کے علاوہ اخلاق سیرت اور تاریخ کے متعلق خاص خاص الفاظ اور اصطلاحات کی فراوانی ہو گئی تھی۔ گو خالص ادبی کتابیں ایک دو سے زیادہ نہیں لکھی گئیں۔ لیکن اکثر عبارتوں میں ادبیت کی جھلکیں نمایاں ہیں اور بعض تو بالکل مقفیٰ اور مسجع نظر آتی ہیں۔

---

[1] دیکھو "دکن میں اردو" طبع اول صفحہ (۹۵)

[2] دیکھو "اردوئے قدیم" مطبوعہ تاج پریس حیدرآباد صفحہ (۱۱۲)

گزشتہ دور کے اسلوب سے اس دور کے طرز بیان میں بعض تغیر ضرور معلوم ہوتے ہیں اول یہ کہ اس میں وہ گنجلک باقی نہیں رہے تھے جنکا ابتدائی نثر میں ہونا ضروری تھا۔ دوم یہ کہ اکثر کارنامے فارسی کے تراجم ہونے کے باعث فارسی کے اسلوب بیان کے بالکل چربے نظر آتے ہیں ۔

حسب ذیل نمونے ان دونوں خصوصیات کو نمایاں کرتے ہیں :-

(۱) بات کرنے سوں نماز جاتا ہے ۔ نماز میں آدمیاں کی مثال دعا مانگے ۔ نماز جاتا ہے بہی واہ کہنے سوں نماز جاتا ہے ۔ درد سوں یا مصیبت سوں نماز جاتا ہے ۔ روئے سوں یاد نیا کی سبب سوں نماز جاتا ہے ۔ نماز میں کسی موت کی خبر سنکر (قالوا انا للہ وانا الیہ راجعون) بولتے سوں نماز جاتا ہے ۔ خبر عجب سنکر نماز جاتا ہے (احکام الصلوٰۃ)

(۲) دوم کلمہ شہادت ۔ دوسرا کلمہ بولتا ہوں میں شہادت کا یعنی گواہی دیتا ہوں اس خدا تعالیٰ کے ایک پنے پہ ۔ اشہد ہور گواہی دیتا ہوں (ان لا الہ) کہ نہیں کوئی معبود برحق ..... (احکام الصلوٰۃ)

(۳) تمام مصحف کا معنا الحمد للہ میں ہے مستقیم ہور ۔ تمام الحمد اللہ کا معنی بسم اللہ میں ہے قدیم ہور (تمام بسم اللہ کا بسم اللہ رکھیا ہے کریم ..... (سب رس)

(۴) دنیا میں خوب گنوائی چار لوگاں میں عزت پائی ۔ جتنی رہی کھری واں بھول پڑیکا نہ آفت دیکھی نہ زلزلہ اپلے بھلے تو عالم ہلا کس کل پڑا [illegible]

(۵) اپنی حیات کے وقت منجے اشارت کئے تھے جوں شمائل الاتقیا کتاب کوں ہندی زبان میں لیاوے تا ہر کسی کوں سمجھا جاوے اس وقت منجے بیا ہیں تا کہ یک ہزار ستر پر آٹھواں سال کوں رحلت کئے (ترجمہ شمائل الاتقیاء)

(۶) بولتا ہے کمترین مرید ہور واپس ترین شاگرد۔ جاروب کش درگاہ عالی ہور بارگاہ اعالی عاجز فقیر الحقیر محمدؐ ولی اللہ حکم کئے منجکوں حضرت شہباز ولایت معدن ہدایت آفتاب عالمتاب بزرگ اولیا کے۔ بڑے اتقیاء کے ہور صدر نشین محمدؐ مصطفٰے کے صاحب شریعت ہور طریقت کے دربار حقیقت اور معرفت کے وارث محمدؐ رسول اللہ حضرت شاہ حبیب اللہ قادری۔ باقی رکھے اللہ انوکوں...... (معرفت السلوک)

(۷) بعض علماء متاخرین خلاصہ عربی کتابوں کا نکال کر فارسی میں لکھے ہیں تا وہ لوگ جو عربی نہیں پڑھ سکتے ہیں۔ ان سے فائدہ پاویں۔ لیکن اکثر عورتاں اور تمام آدمیاں فارسی سے بھی آشنا نہیں ہیں۔ اس لئے یہ عاصی مطلب ان کے بہت اختصار کے ساتھ لیکر دکنی رسالوں میں بولا ہے اور ہر رسالہ کے وزن علیحدہ ہونے سے خواہش و آرزو پڑھنے والوں کی زیادہ ہوئے“...... (نثر باقر آگاہ)

(۳)

شمالی ہند میں نثر کے ابتدائی مراحل

دکن میں نثر کی ابتدا ہو کر چار سو سال سے زیادہ گزر جاتے ہیں اور اس عرصہ میں وہ دو چار منازلِ ارتقا بھی طے کر لیتی ہے مگر شمالی ہند اس سے بے خبر رہتا ہے۔ صرف یہی نہیں کہ شمال والوں نے اس میں کوئی کام نہیں کیا، بلکہ وہ اس امر سے بھی ناواقف رہے کہ اردو نثر میں کتابیں لکھی گئی ہیں یا لکھی جا سکتی ہے۔ چنانچہ وہاں سب سے پہلے جس شخص نے اردو نثر میں قلم اٹھایا۔ وہ مولا فضلی ہیں جن کی تحریر سے ہمارے اس خیال کا ثبوت ملتا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچہ میں لکھتے ہیں

> پھر دل میں گذرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیئے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احمدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہوئے اور گوہر مراد رشتہ امید میں نہ آوے لہذا کوئی

اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بعبارت ہندی نثر نہیں ہوا مستمع پس اب اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا۔ اور تامل و تدبیر میں سرگشتہ ہوا۔ لیکن راہ مقصود کی نہ پائی۔ ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دل فگار پر استہزاز میں آ، یہ بات آئینۂ خاطر میں منھ دکھلائی"۔

مولانا کی "وہ مجلس" کے بعد جب ہم شمالی ہند کی نثری کوششوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ مرزا رفیع سودا نے میر تقی میر کی مثنوی "شعلۂ عشق" کو نثر میں لکھا تھا لیکن بقول آزاد "افسوس کہ اس وقت موجود نہیں" مگر سودا نے اپنی کلیات پر جو دیباچہ اردو میں لکھا ہے اس کے مطالعہ سے اس دور کے عام مذاق اور اسلوب بیان کی نوعیت کا کچھ انکشاف ہوتا ہے۔ ان کے چند فقرے یہ ہیں۔

"ضمیر منیر پر آئینہ داران معنی کے مبرہن ہو کہ محض عنایات حق تعالیٰ کی ہر چو طوطی ناطقہ شیریں سخن ہوا۔ پس یہ چند مصرعے جو بہ قبیل ریختہ در ریختہ خامہ دو زبان اپنی سے صفحۂ کاغذ پر تحریر پائے لازم ہے طویل سخن سامعہ سنجان روزگار کردن تا زبان ان اشخاص کے ہمیشہ مورد تحسین و آفریں رہوں

قیمت قدر شناسا ہی سے ہو پہنچتے ہیں ہم ورنہ دنیا میں خزف بھی نہیں گوہر سے کم

مضمون سینہ میں بیش از مرغ اسیر نہیں کہ ہو بیچ قفس کے جس وقت زبان پر آیا فریاد بلبل ہے واسطے گوش وادرس کے۔ غرض جس اہل سخن کا

کیا تھا۔ جو قریب ۱۷۷۶ء ۱۲۰۰ھ میں مرتب ہوا

عبدالقادر منصفی زینت لب ہے سررشتہ حسن معانی کا اس کلام کے اس سے انصاف طلب ہے (اگر حق تعالی نے صبح کاغذ سفید کی مانند شام سیاہ کرنے کو یہ خاکسار خلق کیا ہے تو ہر انسان کے فانوس دماغ میں چراغ ہوش دیا ہے۔ چاہیے کہ دیکھ کر نکتہ چینی کرے ورنہ گزند زہر آلود سے بے اجل کاہے کو مرے۔)

ترجمۂ قرآن مجید ۱۷۹ء

فضلی اور سودا کے بعد ہمارے سامنے محمد حسین کلیم کا نام پیش ہوتا ہے جن کے نسبت صاحب تذکرۂ گلشن ہند فرماتے ہیں "ایک رسالہ عروض و قافیہ کا اس نے زبان ریختہ میں لکھا ہے اور "فصوص الحکم" کا ترجمہ بھی ہندی زبان میں لکھا ہے۔ ایک نثر اور بھی زبان ریختہ میں رنگینۂ قلم معنی رقم رکھتا ہے"۔ مگر اس ذکر کے سوا کلیم اور ان کے نثری کارناموں کے متعلق ہمیں کسی قسم کا علم نہیں۔

محمد حسین کلیم کے علاوہ ایک اور صاحب میر محمد عطا حسین تحسین ہیں۔ جن کے متعلق آزاد لکھتے ہیں " میر محمد عطا حسین خان تحسین نے چار درویش کا قصہ اردو میں لکھکر نو طرز مرصع اس کا نام رکھا شجاع الدولہ کے عہد میں تصنیف شروع ہوئی ۱۷۹۸ء ۱۲۱۲ھ نواب آصف الدولہ کے عہد میں ختم ہوئی"۔ اس دور کے دو کارنامے زیادہ قابل ذکر ہیں (*) ایک شاہ عبدالقادر صاحب کا "ترجمۂ قرآن مجید" اور دوسرا انشاء اللہ خان

ھ کی کتاب "دریائے لطافت" موخرالذکر کا درجہ نثر اردو اور اس کے اسالیب بیان کی ارتقائی تاریخ میں نہایت اہم ہے۔ شمالی ہند میں نثر اس وقت تک جس حالت کو پہنچ چکی تھی اس کا کما حقہ اندازہ "دریائے لطافت" کی ان عبارتوں سے ہو سکتا ہے جو بطور مثال کے جابجا استعمال کی گئی ہیں اس کتاب میں جہاں سید انشاء نے اپنی اور مرزا مظہر جان جاناں کی طرز گفتگو حسب ذیل طریقہ کی دکھائی ہے:-

> ابتدائے سن سال سے تا اوائل ریحان اور اوائل ریحان سے الی الان اشتیاق مالایطاق تقبیل آستانہ علیہ نہ بجارے تھا کہ سلک تحریر و تقریر میں منتظم ہو سکے۔ لہذا بہ واسطہ و وسیلہ حاضر ہوا ہوں (مرزا جان جاناں کا جواب) اپنے تئیں کوں بھی بدو طفلی سے تمہیں ایسے اشخاص کے ساتھ موانست اور مجالست رہا کی ہے"۔ لطف

میر جعفر غنی کی (ایک کسبی کے ساتھ) باتیں بھی نقل کی ہیں جن کا اسلوب بیان متذکرہ بالا عبارت سے بیحد مختلف ہے اور جس کی وجہ سے نثر کی تاریخ ارتقاء پر روشنی پڑتی ہے۔ چنانچہ بی نورن کہتی ہیں۔

> اجی آؤ میر صاحب! تم تو عید کے چاند ہو گئے۔ دلی میں آتے تھے دو دو پہر رات تک بیٹھتے تھے۔ اور ریختہ پڑھتے تھے۔ لکھنؤ میں تمہیں کیا ہو گیا کہ کبھی صورت بھی نہیں دکھلاتے۔ ایسے گئے گزرے میں

کتنا میں نے ڈھونڈا کہیں تمہارا اثر معلوم نہ ہوا۔ ایسا نہ کیجیو۔ کہیں آٹھوں میں بھی نہ چلو۔ تمہیں علی کی قسم آٹھوں میں مقرر چلیو۔"

میر صاحب جواب میں کہتے ہیں :۔

اجی بی نورن یہ کیا بات فرماتی ہو تم تو اپنے جیوڑے کی چین ہو پر کیا کہیں جب سے دلی چھوڑی ہے کچھ جی افسردہ ہو گیا ہے۔ اور شعر پڑھنے کو جو کہو تو کچھ لطف اس میں بھی نہیں رہا کہ مجھ سے سنو ریختہ میں استاد میاں ولی ہوئے۔ ان پر توجہ شاہ گلشن صاحب کی تھی۔

اس دور کے متذکرہ بالا نمونوں کے مطالعہ کے بعد ہم شاد عظیم آبادی کے ہم آہنگ ہو کر کہ "شمالی ہند میں سنہ ۱۸۰۰ء تک کوئی نثر اردو کی کتاب ہماری نظر سے ایسی نہیں گزری جس میں کوئی فن یا کسی طرح کا قصہ بیان ہوا ہو جا بجا اگلے وقت کی عبارتیں لکھی دیکھی ہیں۔ جن میں لغات غیر مانوس، عربی فارسی کا جماؤ اور قافیوں اور ذومعنی لفظوں کے جھوٹے نگینے بہت سے جڑ دئے ہیں۔ فقط روابط کہیں کہیں اردو کا پتہ دئے جاتے ہیں" اس قدر کہنا چاہتے ہیں کہ مرزا رفیع سودا کی نثر سے قطع نظر کرکے جو بالکل تعقید سے بھری ہوئی ہے دوسرے نمونے دلکش گو غیر منضبط ہیں۔ تاہم دکن کی ابتدائی تحریروں سے شمالی ہند کی ابتدائی عبارتیں زیادہ پُر تکلف معلوم ہوتی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی فارسی ہی کا تتبع

کیا گیا ہے۔

اس زمانہ میں ہندو اور مسلمان دونو فرقوں کی ذہنیت پر فارسی کا اتنا گہرا اثر چھایا ہوا تھا کہ اس کا یکایک زائل ہو جانا سخت دشوار تھا۔ اور اگر تقریبًا ایک صدی کے بعد سرسید کی کوششیں ایک معجز اثر کام کے ذریعہ (جس کا مفصل ذکر آیندہ کیا جائیگا) اس کو دور نہ کر دیتیں تو نہ معلوم کتنی صدیوں تک ہندوستانیوں کے سر سے فارسی کی تقلید کا بھوت نہ اتر سکتا، اور اردو زبان میں فارسی کے وفادار متبعین کے قلموں سے جگہ جگہ بدنمائیاں پیدا ہوتی رہتیں۔

(۵)

غدر اور اس کے قریبی زمانہ میں نثر کی حالت

گزشتہ دور کی کتابیں اگرچہ انگریزوں کی سرپرستی سے اور انہی کے لئے تیار ہوئی تھیں لیکن مذاق اور اسلوب بیان کے لحاظ سے وہ خالص ہندی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرصہ دراز تک بے حد مشہور اور مقبول رہیں۔ انھوں نے اردو نثر لکھنے کا ایک ایسا معیار تعین کر دیا کہ اس کے بعد پچاس سال تک نثر نویس اسی کی رہبری میں کام کرتے رہے۔

کلکتہ کی اس طرز روش کا اثر لکھنو پر بہت دیر سے پڑا۔ اس کے بعد بھی وہاں جو کتابیں لکھی گئیں وہ بالکل پرانے رنگ کی ہیں۔ لکھنو والے اپنے نہج بیان کو بدلنے کی جگہ الٹا کلکتہ کے کارناموں کی ہنسی اڑاتے رہے۔ چنانچہ جب مرزا رجب علی بیگ سرور نے اسی زمانہ میں "فسانۂ عجائب" لکھی تو میرامن کے اسلوب بیان کا اس طرح مضحکہ اڑایا۔

اگرچہ اس ہیچمدان کو یہ یارا نہیں کہ دعویٰ اردو زبان پر لائے یا اس فسانہ

کو بنظر نثاری کسی کو سنائے اگر شاہجہان آباد کہ مسکن اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا۔ وہاں چندے بود و باش کرتا فصیحوں کو تلاش کرتا فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امن صاحب نے چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے کہ ہم لوگوں کے دین و حصہ میں یہ زبان آئی ہے دلی کے روڑے ہیں کہ محاوروں کے ہاتھ پاؤں توڑے ہیں پتھر پڑے ایسی سمجھ پر کہ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے۔ فسانہ عجائب ص۱۷ مطبوعہ نولکشور

جمعیت

صرف لکھنؤ ہی میں نہیں دہلی والوں کا مذاق بھی پہلے یہی تھا۔ لیکن وہ کلکتہ کے اثر سے بہت جلد جادۂ اعتدال پر گامزن ہو گئے۔ غدر کے بعد مولانا غلام امام شہید نے ایک کتاب "انشائے بہار بے خزاں" لکھی۔ اگرچہ اس کا اسلوب بیان نہایت صاف اور سلیس ہے۔ لیکن اس میں انھوں نے انشاپردازی کے جو اصول اور نمونے پیش کئے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا ان کا ماحول کس مذاق کو پسند کرتا تھا۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اگر باغ اور مکان کی تعریف منظور ہو تو اس کے لکھنے کا طور یہ ہے' تاج گنج کے روضہ کی تعریف:۔ آج قلم کا دماغ پھولوں کی خوشبو سے معطر ہے کاغذ صفحۂ آنکھ کی سفیدی کی طرح منور ہے نظر کا ڈورا رگ گل کے طور پر رنگین ہے۔ نگاہ کا تار رشتۂ گلدستہ کی مانند بہاریں ہے۔ کس واسطے کہ مجھے ایک باغ اور مکان کی صفت لکھنی منظور ہے۔ جس کی سیر سے چشم مردم میں

نوز ہے۔ اس کے صحن اور دالان میں خدا کی قدرت کا گل کھلا ہے چمن اور میدان صانع کی صفت کا تماشا ہے۔ وہ کون مکان اور کیسا مکان جو شاہجہاں ایسے بادشاہ عالیجاہ کا قیام گاہ ہے کون اور کیسا ایوان جو جناب عالیہ بادشاہ بیگم کا آرام گاہ ہے" (صفحہ (۵۷) مطبع جوہر ہند دہلی)

اسی زمانہ میں ایک مذہبی تحریک پیدا ہوئی تھی جس نے اردو کے اسلوب بیان کی درستی میں بے حد مدد دی۔ اس کے بانی غیر مقلد مولوی سید احمدؒ تھے اکثر جگہ اور خاص طور پر مشرقی ممالک کا ایک عام قاعدہ ہے کہ ادبی مرقومات کا سب سے پہلا اور خاص موضوع مذہب ہوتا ہے چنانچہ سید احمدؒ کی تحریک پر تنقید اور بحث مباحثہ کا ایک طوفان اٹھا اور اس کی وجہ سے اردو نویسوں کے ہاتھ خیالات اور حالات کا ایک کثیر مواد آ گیا۔

مولوی سید احمدؒ صاحب کے پرجوش شاگرد سید عبداللہ نے ان کی ایک فارسی تصنیف تنبیہ الغافلین کا اردو میں ترجمہ کیا۔ اور اسے ۱۸۳۰ء میں شایع کیا۔ حاجی اسمعیل شہید نے "تقویت الایمان" لکھی۔ اس کے بعد غیر مقلدوں کی طرف سے اور بہت سی کتابیں لکھی اور تصنیف کی گئیں جن میں "ترغیب جہاد" اور "ہدایت المومنین" قابل ذکر ہیں۔

اس دور کے ختم کرنے سے قبل مرزا غالب کی خدمات کی داد دینی ضروری ہے۔ مرزا نے اگرچہ عمداً اردو کے اسلوب بیان کی طرف کوئی تو [illegible] کی

دہلی

لیکن ضمنی طور پر "اردوئے معلی" اور "عود ہندی" جیسا گراں بہا خزانہ جمع کر دیا یہ وہ کتابیں ہیں جو تاریخ ارتقائے اسلوب بیان میں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں

غالب ہر مضمون کو اسی اسلوب میں ادا کرتے ہیں جو اس کے لئے موزوں ہے۔ مثلاً خطوط میں وہ نہایت سادہ اور دلی کی روزمرہ کی زبان استعمال کرتے ہیں۔ یہاں روزمرہ سے مراد وہ زبان نہیں جو عام طور پر بازاری محاورات اور عورتوں کے الفاظ پر مشتمل ہے بلکہ وہ زبان جس سے دہلی کے شریف، مہذب اور تعلیم یافتہ طبقے آشنا تھے۔ جہاں انھوں نے خطوط میں سادگی اختیار کی ہے۔ تقریظوں اور دیباچوں وغیرہ کو قلم سنبھال کر لکھا ہے۔ لیکن ان کی موخرالذکر عبارتیں اس زمانہ کے عام مذاق کے موافق بالکل مقفیٰ اور مسجع ہیں۔

مرزا غالب اگرچہ اپنے ماحول کے اقتضا سے اس قسم کی تحریریں لکھنے کے لئے مجبور ہو جاتے تھے تاہم ان کی طبعی ظرافت نے ان کی طرزِ ادا کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ وہ اپنی قوت اظہار سے نہ صرف اپنا مطلب دلنشین کر دیتے ہیں۔ بلکہ ظرافت کی موجوں سے مخاطب کے دامن کو سرور و انبساط سے بھر دیتے ہیں۔ اور ایک ذرا سی ترکیب لفظی یا ایک چھوٹے سے جملے میں وہ کچھ کہہ جاتے ہیں کہ آدمی گھنٹوں

مزے لیتا ہے -

یہ دور غالب پر ختم ہو جاتا ہے - یہی وہ درمیانی زمانہ ہے جس کے بعد اردو علم و ادب میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہونے والا تھا اس زمانہ میں اردو نثر کی جو کتاب قابل وقعت سمجھی جاتی تھی وہ ضرور کسی نہ کسی کتاب کا ترجمہ ہوتی تھی کیونکہ پہلے پہلے فارسی عربی اور ہندی کتابوں ہی کو ریختہ کا لباس پہنانا بہت بڑا کمال سمجھا جاتا تھا - چنانچہ ۲ آزاد اردو اور اس کے اسلوب بیان کے متعلق حسب ذیل خیال ظاہر کرتے ہیں -

> زبان اردو کے پاس جو کچھ سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے - اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے - جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اڑی لفاظی اور مبالغوں کے زور سے ۱۸ آسمان پر چڑھ گئی وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی - اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور رہے - مضامین عاشقانہ گلگشت مستانہ نصیبوں کا رونا امید موہوم پر خوش ہونا امرا کی ثنا خوانی جس پر خفا ہوئے اس کی خاک اڑائی - البتہ ان رنگوں میں

اس لئے لطافت اور نازک خیال کو یہاں تک پھونچایا کہ حد سے گذار دیا...... فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں جن کے خیالات باریکی اور تاریکی عبارت میں جگنو سے اڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصل ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں ایسی ماں کا دودھ پی کر اردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا "

جہانگیر ایک روز اس کمرے میں جا نکلا جو ضیائے حسن سے "شیش محل" ہو رہا تھا حور وش کنیزوں کے حلقہ میں زرق برق لباس آنکھوں کو خیرہ کئے دیتے تھے فطرت کی لاڈلی "ہمہ غمزہ ہمہ عشوہ ہمہ ناز" نہایت سادے باریک سفید لباس میں تھی لیکن شیشے کی طرح صاف شفاف، جسم جھلک رہا تھا ؎

کلائی وہ نازک سی ہیرہ تراشش
وہ محرمن سربستہ ایک راز فاشش

"مقیاس الشباب" کی سرکشی بتا رہی تھی کہ وہ دستانے کی طرح چپکی ہوئی محرم سے زیادہ اودی اودی رگوں کے پیچ و خم اور اعصاب کی قدرتی کھینچ تان کی ممنون ہے اس پردہ کافوری برہنہ حصہ افق، خیال کے لئے کیا باقی رہا! غرض مہرالنسا عالم تصویر بنی ہوئی تھی، شاہی نگاہیں جگر حسن عریانی کا جائزہ بھی نہ لینے پائی تھیں کہ ایک کہربائی قوت لئے بجلی کے تاروں میں نہیں زلف عنبریں کے پیچوں میں جہاں پناہ کو جکڑنا شروع کیا شاہانہ تمکنت نے دیکھتے دیکھتے حسن گلو سوز سے شکست کھائی جہانگیر سے ضبط نہ ہو سکا دل کا چور زبان پر یوں آیا" ..... افادات مہدی ص ۱۴۷

درحقیقت مہدی حسن افادی اقتصادی کی جواں مرگی نے اردو کو ایک ایسے مہتم بالشان انشا پرداز سے محروم کر دیا جس کے شاہکاروں کی صحت بیان، لطافت خیال، متانت بیان، شوخی ادا اور "تنقیط ادب" میں التذکرہ"

"قاصر النظر" "تحسین ناشناس" "مقیاس الشباب" "قوت آخذہ" اور "فتوحات ہے دوآتشہ" وغیرہ جیسی پختہ ترکیبیں اردو زبان میں بہت جلد ایک رسکن، ایک آسکر وائلڈ یا ایک اسٹی ون سن کے کارناموں کی متحد نظیر پیش کرسکتیں! یہ وہ محرومی ہے جس کی تلافی متعدد انشاپردازوں کی متفقہ کوششوں پر بھی نہ معلوم کتنے زمانہ میں ہو سکے!!۔

بیسویں صدی کی ابتدا کے وقت اردو علم و ادب کا نیر اقبال کافی بلند ہو چکا تھا، یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اردو زبان کی ذہنی مملکت میں جو پہلے صرف اقلیم شعر و شاعری پر منحصر تھی، تاریخ فلسفہ اور متعدد علوم و فنون کے وسیع حصے بھی شامل ہو چکے تھے۔ سرسید اور ان کے متعدد ہم نواؤں کے بلند آوازے جو اکثر دفعہ صدا بصحرا ثابت ہو چکے تھے۔ اس وقت اقصائے ہندوستان میں پہنچ پہنچ کر صدائے بازگشت کے ساتھ بلند ہوتے جارہے تھے یا تو ایک زمانہ تھا کہ ع کارواں بے حس ہے آواز درا ہو یا نہو۔ کے مطابق سرسید کو قافلۂ ہند کے ایک ایک فرد پر سکوت جامد چھایا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اور اب وہ وقت ہے کہ اسی بے حس قافلہ میں سے بعض بعض افراد ایسے بھی نکل پڑے ہیں جو خود حدی خوانی پر مستعد نظر آتے ہیں۔

تہذیب الاخلاق کے بعد مخزن، دکن ریویو، حسن، ادیب، العصر، دلگداز، ذخیرہ اور زمانہ وغیرہ وہ قابل یادگار گہوارے ہیں جن میں

اردو نثر کی کافی نشو و نما ہوئی ۔ خان بہادر شیخ عبدالقادر، مولانا ظفر علی خاں مولوی عزیز مرزا، سجاد حیدر یلدرم سلطان حیدر جوش، سید محمد فاروق شاہجہاں پوری، احسن مارہروی، سجاد مرزا بیگ دہلوی، محمد عبدالرؤف عشرت مولوی ممتاز علی شاکر میرٹھی، خان بہادر سلطان احمد، منشی عنایت اسد اور اسی سلسلہ میں دیا نراین نگم، پنڈت برج نرائن چکبست، پیارے لال شاکر، پریم چند اور سدرشن وغیرہ ایسے انشا پرداز ہیں جنھوں نے ایک خوشگوار مستقبل کی شگفتہ امیدوں کو اپنی مختلف الموضوع تحریروں کے ذریعے سے ہر وقت تر و تازہ رکھا ۔ ان کے ذریعے سے اردو نہ صرف موضوع بلکہ اسلوب بیان کے لحاظ سے بھی نہایت وسیع ہوگئی اور در اصل یہی وہ آبیاریاں ہیں جنھوں نے اردو کو اس قابل بنا دیا کہ وہ مستقبل قریب میں دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے پہلو بہ پہلو رہ سکے ۔

اسی زمانہ میں جب کہ اردو کا اسلوب ترقی کی طرف گامزن تھا ۔ ابو الکلام آزاد نے الہلال جاری کر کے ایک جدید طرز انشا کو رائج کیا ۔ یہ طرز اگر ان ہی کی حد تک محفوظ رہتی تو کوئی مضرت رساں بات نہ تھی لیکن افسوس ہے کہ اول اول نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں پر اس کا بہت گہرا اور بہت برا اثر پڑا ۔ معلوم ہوتا ہے ابو الکلام کی مخصوص ذہنیت نے سر سید کی اصلاحی کوششوں کے لئے ردعمل کا کام کیا ۔ ان کا اور ان کے مقلدین کا غالباً یہ عقیدہ ہے کہ

اردو زبان میں مذہب اسلام کی جملہ اصطلاحات اور اس کے متعلقہ عربی و فارسی لفظوں کو بالکل بے تکلفی سے استعمال کرتے رہنا چاہیئے تاکہ مسلمان ان سے ہر وقت دوچار ہوتے رہیں۔ اور اس طرح ان کے مذہبی معتقدات موقع بموقع تازہ ہوا کریں۔ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے ایک محترم استاد جو دبستان ابوالکلام کے زبردست خوشہ چین نظر آتے ہیں اس امر کے مدعی ہیں کہ وہ آج تک اپنے متفرق مضامین کے ذریعہ سے اس فرض کو بآئین شایستہ انجام دیتے رہے ہیں کہ قرآن پاک کے جملہ الفاظ اردو زبان میں رائج کردیئے جانے چاہیئں۔

اس میں کوئی شک نہیں اگر مذہبی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک عظیم الشان کام ہے، لیکن جہاں تک ادبیات کا تعلق ہے اندیشہ ہے کہ یہ کارگزاری مضر نہ ثابت ہو۔ زبان ایک عام پونجی ہے جس پر ہر شخص آزادی کے ساتھ متصرف ہے کسی کو یہ حق نہیں کہ اسے اپنے لئے مخصوص کرلے اور نہ کوئی کرسکتا ہے۔ پس اردو جس پر مسلمانوں کو وہی حق حاصل ہے جو ہندوؤں کو ہے کبھی خاص فرقے یا مذہب کی قید میں نہیں رہ سکتی ہاں اگر متذکرہ بالا مقصد اس طرح انجام پا سکتا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس سے مساویانہ طور پر بہرہ ور ہوسکیں تو اس سے بڑھکر خوش آیند کام نہیں ہوسکتا ہمیں یہاں اس مقصد کی نوعیت پر اعتراض منظور نہیں بلکہ ہم ابوالکلام آزاد کی زبان

عبارتوں کا ذکر کرنا چاہیئے ہیں۔ جن میں عربی و فارسی کے دقیق سے دقیق الفاظ اور ترکیبیں بے دھڑک استعمال کی جاتی ہیں ۔

اسی سلسلہ میں اس امر کا بھی اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً اسی زمانہ سے بعض ہندؤں میں بھی اس قسم کی ناروا رغبت شدت سے ترقی کرتی جا رہی ہے ۔ اور وہ بھی اکثر سنسکرت اور ہندی بھاشا کے الفاظ اپنے سیاسی اقتصادی اور صوفیانہ مضامین میں فیاضی کے ساتھ استعمال کرنے لگے ہیں ۔ لیکن جو تعلیم یافتہ اور سمجھدار ہندو سمجھتے ہیں کہ اردو کو ہندوستان کی ایک عام زبان بننا چاہیئے وہ اس کے مخالف ہیں اور خود نہایت صاف سیدھی زبان استعمال کرتے ہیں جب تک ہندو اور مسلمان دونوں کچھ نہ کچھ ایثار سے کام نہ لیں گے اردو کا اسلوب ہرگز ترقی نہیں کرسکیگا ۔

مولانا ابوالکلام کے اسلوب کے نمونے :-

بہر حال اصحاب تاویل وراے اور متکلمین و اتباع فلاسفہ کی بے حاصلی اور نامرادی اور سلف امت و اصحاب تفویض کے مذہب حق و واقعی حکمت اور عقلیات صادقہ و فاضلہ کے اثبات و نصرت میں امام ابن تیمیہ کے مباحث و مقالات [illegible] ہیں و تواضع کا عالم بھی دوسرا ہے اور افسوس امت کی محرومی اور درماندگی پر کہ صدیوں سے یہ خزائن معارف کنوز و حقایق موجود ہیں۔ مگر کوئی ان کا شناسا و عارف پیدا نہ ہوا بلکہ ہمیشہ غفلت جہل

اور تعصب و جمود کی تاریکیوں میں مدفون و مجہول رکھا گیا۔

از تذکرہ حصہ اول مولفہ مولانا ابوالکلام آزاد مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۹ء ص ۱۵

(۲) منجملہ امثال قرآنیہ کے ظہور آثار و علایم بارش کی ایک لطیف و بدیع اور جامع و مانع تمثیل ہے جس پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے اور جس کے اندر انسان کی قلبی و روحی حیات و ممات، اقوام و ملل کے انقلابات ملکوں اور حکومتوں کے تسلط و تنزع اور ہدایت الٰہی اور شقاوت انسانی کے مختلف مدارج و مراتب کی نسبت صدہا اشارات و بیانات پوشیدہ ہیں۔

از الہلال جلد (۳) نمبر (۱) ص ۵ مطبوعہ کلکتہ ۱۹۱۳ء

نیاز فتحپوری کے اسلوب میں بھی نامانوس الفاظ اور عجیب و غریب ترکیبوں کی وجہ سے کہیں کہیں ابوالکلام کا رنگ جھلک پڑتا ہے۔ ابوالکلام کا موضوع مذہب ہے اور نیاز کا ادبیات۔ اس لئے موخرالذکر کی تحریروں میں رنگینی اور شوخی جگہ جگہ نمودار ہو جاتی ہے۔ ابوالکلام کو باوجود اپنے فطری بانکپن کے ضرور سنجیدگی قایم رکھنی پڑتی ہے۔ نیاز ایک فنکار ہونے کی حیثیت سے آزاد ہیں۔ وہ اپنے اسلوب میں جس قدر چاہیں رعنائی پیدا کر سکتے ہیں۔ اور یہ رعنائی جس قدر بڑھی ہوئی ہوگی ان کی ادبی شان میں اتنا ہی اضافہ ہوگا۔

ابوالکلام کے بہ نسبت نیاز کا دائرہ عمل زیادہ وسیع ہے۔ ادبیات اردو کا

ہر طالب علم نیاز کی تحریروں کی طرف نظر شوق کے ساتھ بڑھتا ہے اور ان کے مطالعہ کے بعد کسی نہ کسی طرح متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا یہی وہ امر ہے جس کو مدنظر رکھتے ہوئے نیاز کی عجیب و غریب ترکیبوں اور نامانوس لفظوں سے خوف ہے کہ کہیں وہ اردو اسلوب بیان کے لئے مضر نہ ثابت ہوں

نیاز فتحپوری کے اسلوب کے نمونے:۔

(۱) اگر میری دعا قبول ہوتی تو میں تمہارے اس لمحۂ الوہیت گزر جانے کے بعد خدا سے التجا کرتا کہ الٰہی شہاب کو انہیں میں سے ایک سخت و سنگین پیکر کی محبت میں اس قدر شدت کے ساتھ مبتلا کر دے کہ وہ دیوانہ وار اس پتھر کی مورت کے سامنے جبیں سائی کرے ۔ وہ فریاد کرے اور کوئی سننے والا نہ ہو، وہ درد محبت سے چیخ چیخ اٹھے اور کسی کو خبر نہ ہو وہ رو رو کر طوفان نوح برپا کر دے لیکن کوئی اس کے آنسوؤں کا پوچھنے والا نہ ہو، تاکہ میں تمہیں اس وقت نصیحت کروں کہ شہاب حسن کو صرف حسن کے لحاظ سے چاہو، محبت کو صرف محبت کے لحاظ سے دیکھو ۔۔ یہ بیقراری کیوں ہے یہ اضطراب کس لئے ہے تمہارا ذوق نظر پورا ہو رہا ہے ۔ تمہاری نگاہیں اچھی طرح آسودہ ہو رہی ہیں پھر اور تمہیں کیا چاہیئے سچ بتاؤ ۔ شہاب کیا ہوا اگر دفعتاً تمہیں کسی مجسمہ یا تصویر سے عشق ہو جائے ۔ تم کیا کرو کم از کم مجھے تو بڑا لطف آئے

(شہاب کی سرگذشت)

(۲) ہلکی شفقی روشنی ہے کرہ زمین تاریک ہے ۔ فضا میں صرف ایک سیارہ جھلملا رہا ہے ۔ ایک لڑکی جس کی آنکھوں پر پٹی ہے ۔ اور ہاتھ میں بربط سارے کرہ پر چھائی ہے بربط کے تمام تار ٹوٹ چکے ہیں مگر ایک جس میں وہ برابر لرزش پیدا کر رہی ہے (تصویر امید)

آج کل اردو ادب کے دلدادہ اپنی انشا پردازی کو اکثر نیاز کے اسلوب کی پیروی کے ساتھ شروع کرتے ہیں ۔ خصوصاً وہ اسلوب بیان جو ٹیگور کی نظموں کا ترجمہ کرنے کے لئے اور اسی نوع کے دیگر مضامین لکھتے وقت انھوں نے استعمال کیا تھا، نوجوان انشا پردازوں میں بے حد مقبول ہوا ۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہوگی کہ اس اسلوب کے ذریعہ دل دادگان ادب اپنے اس قسم کے شاعرانہ خیالات آسانی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں ۔ جن کا اظہار نظم کے ذریعے ایک تو اس زمانہ میں نامقبول سمجھا جانے لگا ہے اور دوسرے وقت طلب ہے چنانچہ اس طرز میں آئے دن سیکڑوں مضامین لکھے جاتے ہیں ۔ اور لطف یہ کہ مضمون نگار نیاز کی طرح خود بھی نئے نئے الفاظ ایجاد کرنے کے متمنی رہتے ہیں ۔ اس کوشش میں وہ اور بھی راہ راست سے دور جا پڑتے ہیں ۔ اس کا اصلی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ آج کل عربی میں مہارت تامہ حاصل کرنے کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور عربی زبان سے واقفیت حاصل کئے بغیر اس قسم کی جرات رندانہ یقیناً

ایجاد بندہ سے کم نہیں ہو سکتی۔

ابو الکلام کی انشا پردازی جس گہرے رنگ میں ڈوبی ہوئی ہے اسی رنگ میں مگر ذرا ہلکی تحریریں عبداللہ العمادی، تاجور نجیب آبادی، حیدر یار جنگ طباطبائی، حافظ اسلم جیراجپوری اور عبدالماجد فلسفی کے قلم سے نکلتی ہیں۔ اگرچہ ان میں نیاز کی عبارتوں کا سا بانکپن تو نہیں پایا جاتا تاہم بالکل سادہ بھی نہیں ہوتیں۔ خصوصاً عمادی اور تاجور کا قلم اکثر رنگ برنگ کے بیل بوٹے اتارتا جاتا ہے ان کا قلم نقاش ہے۔ عبدالماجد کی طرح مصور نہیں۔ عبدالماجد کی تحریریں عکسی تصویریں ہوتی ہیں۔ جن میں کسی چیز کا عکس بعینہ محفوظ ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے عمادی اور تاجور پرانی طرز کے نقاش ہیں جن کی رنگ آمیزیاں یقیناً دلچسپ قابل قدر اور بے نظیر ہوتی ہیں۔ "فلسفی شاہ" کی تحریروں میں اگرچہ عربی اور فارسی کے الفاظ کا فقدان نہیں۔ لیکن عمادی اور تاجور کی عبارتوں کی طرح ان میں جگہ جگہ مولویت نمایاں نہیں ہوتی۔

علامہ عبداللہ العمادی کی طرز تحریر کے نمونے:۔

(۱) لیکن اقبال کا دل وحی الہی کا آئینہ دار ہے۔ کشف عطا رہے۔ اس کے سامنے سے آسمان و زمین کے پردے اٹھا دیے ہیں۔ اور اس کو صاف نظر آرہا ہے کہ گزشتہ شب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نظامی سے

مخزن اسرار میں جو فریاد کی تھی اس چودھویں صدی میں وہ دعا مستجاب ہوئی کو ہے توحید کی عنقریب آنی والی عظمت کا نظارہ اس کے روبرو ہے اور وہ محو حیرت ہے کہ دنیا کیا ہے کیا ہو جائے گی۔ ہر ایک اسلامی زبان کی شاعری میں یہ خصوصیت اقبال ہی کے لئے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں یہی ایک حسان الہند ہے جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لیکر پیرینیز تک کی چوٹیوں پر اعلائے لوائے نبوی کے لئے قوم کو آمادہ کر رہا ہے"۔ (تقریظ کلیات اقبال)

"بہت مدت گذری دنیا نے یہ سماں دیکھا تھا کہ عبد اللہ المامون کے عہد میں عربی زبان تمام دنیا کے علوم و فنون کی سرمایہ دار ہو رہی تھی۔ اب بغداد کا وہی نظارہ حیدرآباد میں نظر افروز ہے۔ کہ شہریار دکن کی معارف نوازی اردو کو علمی زبان بنا رہی ہے جس کے آثار و مآثر میں ایک لطیف نمونہ کتاب زیر نظر ہے"۔ (تنقید روح تنقید)

مولوی عبدالماجد کی طرز تحریر کے نمونے :۔

مولانا شبلی بظاہر یورپ کے مقابل بنکر اکھاڑہ میں اترے اور نادیدہ حریف پر پینترے بدل بدل کر خوب خوب وار کئے۔ لیکن حالت یہ رہی کہ ادھر کسی حریف کی آمد کا نام لیا اور ادھر ہتیا ہاتھ سے چھوٹ کر گر گیا۔ قیاس ہوتا ہے کہ مولانا کی ساری عمر مصروف خواب ہی گئی ہے بعض خواب ایسے ہوتے ہیں جن میں انسان اٹھکر چلتا پھرتا اور سارے کام کاج

کرتا ہے۔ لیکن پھر بھی سوتا ہی رہتا ہے اور اس کی تمام حرکات بیداری کی نہیں بلکہ نوم ہی کی ماتحتی میں انجام پاتی رہتی ہیں کچھ ایسی ہی کیفیت شاید مولوی صاحب موصوف کی بھی رہی۔" (اکبر کا آخری دور شاعری)

(۴) یہ جملہ ایک عمل تسخیر تھا۔ عہد و پیمان، عزم و شہادت کا قلعہ بات کی بات میں مسخر ہو گیا۔ چہرہ پر سرخی کا آنا۔ لبوں پر خفیف مسکراہٹ کا نمودار ہونا اور زبان کا شکریہ کے لئے کھلنا آناً فاناً کا کام تھا بالآخر چند منٹ کے بعد جب ملزم کی رہائی کا حکم سنایا گیا تو دیکھنے والوں نے دیکھا کہ اس فرمان رہائی پر ان چوہدری صاحب کے بھی دستخط تھے؟" (فلسفہ اجتماع)

تاجور نجیب آبادی کی تحریر کی مثالیں۔

مولوی محمد حسین آزاد اگر آج زندہ ہوتے تو وہ اردو کا دور آخر لکھتے اور ان کا غم دوز قلم دنیائے ادب و شعر کی تباہیوں کا خاکہ کھینچتا۔ دہلی کا قدیم تمدن پرانی تہذیب اب کہاں علمی چرچے مٹ گئے پڑھے لکھے لوگ ایک ایک کر کے اٹھ چکے اور اس دیار غریب میں کوئی بہار باقی نہ تھی مگر پھر بھی مولوی ذکاء اللہ اور ڈپٹی نذیر احمد کے دم سے دہلی کا علمی چراغ روشن تھا، مفلس کے جیب میں چند سکے تھے فلک نے وہ بھی لے لئے اب اس کے پاس کیا رہا ہے لے دیکے مولوی سید احمد مولف فرہنگ آصفیہ غنیمت تھے شبنم کے قطرے خاروں کی پیاس کہاں تک بجھاتے تاہم

کچھ زیست کا سہارا تھا۔ حیف وہ بھی نہ رہے اب دلی اور دلی کے مشاہیر کا فسانہ کیا اجڑا دیار بے نور بے رونق پڑا ہے۔

(از مضمون "مولوی سید احمد دہلوی" مطبوعہ رسالہ ہمایون لاہور جلد (۱۱) نمبر (۸) جون سنہ ۱۹۲۴ء صہ ۳۲۴)

(۲) ہندوستانی تعلیم ایسے لوگوں کے ہاتھ میں نہیں جو ہماری ضروریات و حالات سے بےخبر ہیں ایسی زبان میں ہے جس سے ہمارے منہ ہمیشہ اجنبی رہیں گے ایسے مقاصد کے زیر اثر ہے جو ہماری قومی نشو و نما اور ملکی ارتقا کے لئے مفید نہیں ایسے آئین و قوانین کے ماتحت ہے جو اسے عام ہونے سے روکتے ہیں انہیں وجوہات سے جہالت اپنے تمام تباہ کن عواقب کے ساتھ اہل ملک پر مسلط ہے

(از مضمون "عثمانیہ یونیورسٹی" مطبوعہ رسالہ ہمایون لاہور جلد (۳۳) نمبر (۳) صہ ۱۶۲ مارچ سنہ ۱۹۲۴ء)

نظم طباطبائی اور اسلم جیراجپوری کی تحریروں میں اگرچہ مولویت نمودار نہیں رہتی۔ لیکن اول الذکر کی عبارتیں پکار پکار کر کہنے لگتی ہیں کہ ہمارا لکھنے والا پرانی طرز کا انشا پرداز اور تحقیقی قابلیت رکھنے والا عالم ہے۔ اور حافظ اسلم جیراجپوری کے اسلوب میں شبلی کی جدید تحقیقاتی روش اور ذکاء اللہ دہلوی کی سنجیدگی جگہ جگہ جھلک پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی انشا پردازی حالی کی اکثر عبارتوں کی طرح ہر جگہ آزاد کی ادبیت کی ہم آہنگ نہیں ہونے پاتی۔

علامہ طباطبائی کی نثر کے نمونے :—

(۱) مجھے نواب مرزا شوق اور نواب مرزا داغ کی زبان ایک ہی معلوم ہوتی ہے ۔ مرحوم عبدالرحیم خان صاحب بیدل دہلوی جس زمانہ میں حیدر آباد میں تھے اس کو تیس برس کا عرصہ ہوا مجھ سے بیان کرتے تھے کہ داغ ہماری زبان میں شعر نہیں کہتے ۔ اس زمانہ میں داغ بھی حیدر آباد میں موجود تھے اور مشاعروں میں آیا کرتے تھے ۔ یہ فرمانا ان کا بے جا نہ تھا ۔ میرا مطلب یہ ہے کہ شوق کی زبان آج تک مروج و مانوس ہے ۔ اور خواجہ اثر کی زبان کہنہ و متروک ۔ ہاں دیکھنا یہ ہے کہ روانی و برجستگی کس کے کلام میں پائی جاتی ہے اور تصنع و آورد کس کے اشعار میں اس کا فیصلہ بہت آسان ہے" ۔ (اثر و شوق)

(۲) ایک زمانہ میں عنترہ بنی عامر میں جا کر رہا تھا اور اپنی قوم والوں سے لڑائی چھیڑ دی قیس بن زہیر نے عنترہ کو لاکھ بلایا مگر یہ بگڑا ہی رہا نہ آنا تھا نہ آیا ۔ ادھر دشمنوں نے حد سے زیادہ دبانا شروع کیا ۔ آخر قیس کی بیٹی جمانہ شرفائے بنی عبس کی اور عورتوں کو بھی ساتھ لیکر عنترہ کے پاس آئی اور یہ کہا کہ اگر تو اب بھی الگ رہا تو دیکھ بنی عبس تباہ ہو جائیں گے" ۔ (عنترہ بن شداد)

مولانا اسلم جیراجپوری کی طرز تحریر کے نمونے :۔

(۱) بنی عباس کے زمانہ میں جو یونانی کتابیں عربی میں ترجمہ کی گئیں ان میں

مجسطی بھی تھی۔ پہلے یحییٰ بن خالد برمکی وزیر نے کسی شامی سے اس کا ترجمہ عربی میں کرایا تھا۔ لیکن وہ صحیح نہ نکلا اس لئے دوبارہ ثابت بن قرہ نے صحیح ترجمہ کیا۔

لیکن مسلمان اس کتاب کے ترجمہ ہونے سے پہلے جغرافیہ کی ابتدا کر چکے تھے کیونکہ وہ ملکوں ملکوں طلب علم کے لئے سفر کرتے تھے۔ علاوہ بریں تمام دنیائے اسلام سے فریضہ حج ادا کرنے کے لئے ان کو بیت اللہ کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے نہ صرف تجارت اور فتح کی غرض سے بلکہ علمی اور مذہبی ضرورت سے بھی جغرافیہ دانی ان کے لئے لازمی تھی۔ چنانچہ سب سے پہلے مقامات، راستے اور فاصلے وغیرہ کی تفصیل میں جو کتابیں اسلام میں لکھی گئیں وہ ان علماء کی تھیں جن کے کجاوے طلب علم میں ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ مثلاً اصمعی اور سکونی وغیرہ"۔

(۲) ممالک کے نقشے دراصل تاجروں اور ان سے زیادہ فرمانرواؤں کے لئے ضروری ہیں۔ کیونکہ ان کے وسیلے سے ممالک کے فاصلوں اور حالتوں کا اندازہ لگا کر ان کے انتظام میں سہولت ہوتی ہیں۔ مسلمانوں نے بھی ابتداء میں ممالک کے نقشوں کی طرف خاص توجہ رکھی" (فن جغرافیہ اور مسلمان)

سید سلیمان ندوی عبدالسلام ندوی اور صدر یار جنگ حبیب الرحمٰن خاں شروانی تینوں شبلی کے اسلوب بیان کے متبع ہیں مگر شروانی کی تحریریں

بہ نسبت اول الذکر انشا پردازوں کے زیادہ بانکی اور شگفتہ ہوتی ہیں عبدالسلا کی عبارتوں میں علمی تحقیق کے علاوہ ادبی حلاوت بھی پائی جاتی ہے جو ایک دوسری شکل اختیار کرکے مولانا سلیمان ندوی کی عبارتوں کو عبدالماجد کی عبارتوں کی طرح عکسی تصویروں میں منتقل کر دیتی ہے ۔

نواب شروانی کے اسلوب کے نمونے ۔

(۱) اس کشمکش میں آپ کا طرز عمل ثابت کر دیگا کہ آپ حصول تعلیم میں کہاں تک کامیاب ہوئے اور اس جامعہ کی تربیت نے کتنا گہرا اثر آپ کے دل و دماغ پر کیا آئندہ زندگی کا میدان آپ نگاہوں میں امید کا ایسا دلکش سبزہ زار ہے جس کی کامیابی کی راحت لہراری ہے ۔ اور فتح و فیروزی کی بشارت سامعہ نواز ہے ۔ اس دل خوش کن خیال میں خلل انداز ہونا سنگدلی ہو سکتا ہے مگر فرض خیر خواہی مجبور کرتا ہے کہ میں آپ سے کہوں کہ اس سبزہ زار میں کانٹے بھی ہیں نشیب و فراز بھی

(خطبہ جلسہ تقسیم اسناد جامعہ عثمانیہ)

(۲) واقعات ختم ہوئے ۔ افسانہ نہیں واقعات ۔ واقعات کے نتائج پر غور ہمیشہ سبق آموز ہے ۔ آج تعلیم و تربیت" بچہ بچہ کی زبان پر ہے ۔ اور گردن غرور کی بلندی حقیقت کے مشاہدے سے معذور کر چکی ہے ۔ انصاف سے دیکھو کہ آج کوئی تربیت گاہ ایسی ہے جہاں عرفی کی قابلیت کے ادیب پیدا ہوں ۔ نہ کہنا کہ عرفی کی کیا ضرورت ہے ۔ بیسیوں یونیورسٹیاں آج بھی خاقانی و عرفی کا کلام پڑھا رہی ہیں"

(دیوان عرفی شیرازی)

مولانا سلیمان ندوی کے اسلوب کے نمونے :۔

(۱) ذرا ٹھہر جائیے اور ایک لمحہ غور کیجیے! یہ غلط کاری سر منزل نہیں بلکہ سر راہ واقع ہوئی ہے۔ فتنہ غدر کے بعد جب ہم نے آنکھیں کھولیں تو ایک ایسے رہنما کو اپنے قافلہ کا رہبر پایا جو مذہب تعلیم اور سیاست تینوں راستوں کی قافلہ سالاری کے فرائض خود تنہا انجام دے رہا تھا۔ منزل ترقی کے یہ تینوں راستے مختلف الجہات تھے۔ اس لئے ایسے قافلہ سالار کے لئے تصادم مصالح ناگزیر تھا۔

(شذرات معارف جلد (۲) نمبر (۲))

(۲) ربانی خمخانہ عشق کا آخری ہوشمند سرشار، ریاض محبت کی بہار جاودان کا آخری نغمہ خواں عندلیب، نظارہ جمال حقیقت کا پہلا مشتاق، مستور ازل کے چہرۂ زیر نقاب کا پہلا بند کشا زندگی کے آخری گھنٹوں میں ہے، "مرض کی شدت ہے۔ بدن بخار سے جل رہا ہے، اٹھکر چل نہیں سکتا لیکن یک بیک وہ اپنے میں ایک اعلان خاص کی طاقت پاتا ہے۔ مسجد نبوی میں جان نثار حاضر ہوتے ہیں سب کی نظریں حضور کی طرف لگی ہیں، نبوت کے آخری پیغام سننے کی آرزو ہے" (محبوب الٰہی اور اسلام)

مولوی عبدالسلام ندوی کی طرز تحریر کے نمونے :۔

(۱) مسلمانوں میں آج بہت سے لوگ ہیں جو مغربی علوم میں مہارت رکھتے ہیں، بہت سے لوگ ہیں جو قدیم مشرقی علوم سے واقف ہیں اور بہت سے لوگ ہیں جو سیاست و تدبیر کے مرد میدان ہیں لیکن صرف نواب عماد الملک ایک ایسے بزرگ تھے جو ان سب کا

مجموعہ تھے ۔ اس لیے ان کی وفات سے اس قحط الرجال میں جو جگہ خالی ہوئی ہے
وہ مدتوں خالی رہے گی اور اسلامی جماعت کے تمام حلقوں میں ایک مدت تک
ان کی وفات پر ماتم کیا جائے گا" (نواب عماد الملک ۔ نمبر (۶) جلد (۱۷))

(۲) ہندوستان کا آزاد خیال گروہ اگرچہ اپنی آزاد خیالی کا صور نہایت بلند
آہنگی کے ساتھ پھونکتا ہے ۔ لیکن یہ بلند آہنگی زیادہ تر سرسید ۔ سید چراغ علی
شبلی، امیر علی اور بعض انگریزوں کی آواز بازگشت ہوتی ہے، خود اس کی تحقیق
و تدقیق کا کوئی حصہ اس میں شامل نہیں ہوتا، لیکن مصر کا جدید طبقہ بذات خود
مطالعہ اجتہاد اور تحقیق و جستجو سے کام لیتا ہے اور اس کے بعد جو کچھ کہتا ہے وہ
طوطی کی طرح وکسی کے رٹائے ہوئے الفاظ کی تکرار نہیں ہوتا ۔"

(امام غزالی اور فلسفہ اخلاق معارف جلد (۱۸) نمبر (۳))

اس زمانہ میں جب انگریزی اور عربی وغیرہ زبانوں کے ترجمے اردو میں
کثرت کے ساتھ ہونے لگے ہیں ۔ بعض حضرات کو اس خیال میں ترقی دینے کی
رغبت ہوئی ہے کہ اردو جس خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے اسی کے الفاظ
اردو میں کثرت کے ساتھ اختیار کئے جائیں اور جس قدر نئی نئی اصطلاحیں
بنائی جائیں وہ سب بھی اسی خاندان کے اصول کے مطابق ہوں ۔ اس سے
قبل حالی ا کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنی تحریروں میں ہندی الفاظ اختیار
کرنے لگے ۔ غالباً آزاد کو بھی اس کا خیال تھا، خواجہ حسن نظامی بھی خوا

کسی مقصد سے کیوں نہ ہو اس پر ضرور کاربند ہیں ۔ اور وحید الدین سلیم بھی اخباری دنیا کی خاطر اس کام کو انجام دیتے رہے ہیں ۔ لیکن عبدالحق نے اس امر کو خاص طور پر اہم قرار دیا اور سلیم سے اس کے متعلق ایک کتاب لکھنے کی فرمائش کی جو "وضع اصطلاحات" کے نام سے شائع ہوئی ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عبدالحق اور ان کے ہم خیالوں نے جو اس امر کا خاص طور پر التزام کیا ہے کہ عربی اور فارسی کی جگہ بھاشا کے الفاظ استعمال کیے جائیں کئی حیثیتوں سے قابل قدر ہے ۔ لیکن نیاز کے متبعین کی طرح عبدالحق کے طرفدار بھی اکثر دفعہ حد سے متجاوز ہو گئے ہیں ۔ جب کوئی شخص کسی کام میں حد سے زیادہ منہمک ہو جاتا ہے ۔ تو پھر اس کو اس کام سے متعلقہ برے بھلے کی تمیز باقی نہیں رہتی ۔ جس طرح ایک دولت مند اول اول دولت صرف اس خیال سے جمع کرنے لگتا ہے کہ اس کے ذریعے راحت اور چین حاصل کرے ۔ لیکن جب دولت جمع ہونے لگتی ہے تو رفتہ رفتہ یہ خیال اس کے سامنے سے ہٹ جاتا ہے اور خود دولت اس کا مطمح نظر ہو جاتی ہے ۔ اسی طرح ہمیں اندیشہ ہے کہ اس خیال کے علم برداروں کا مطمح نظر ان ہندو مضمون نگاروں کی طرح جن کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے کہیں یہ نہ رہ جائے کہ ہندی بھاشا کے زیادہ سے زیادہ الفاظ اور اصطلاحیں اختیار کی جائیں ۔ ی ادا اس امر کا امتیاز باقی نہ رہے کہ اس طرح سے اردو کو ایک زبردست تھے، پہنچے گا ۔

جس طرح اربابِ دار المصنفین (اعظم گڈھ) علمی اور عملی نیز ظاہری اور معنوی حیثیتوں سے شبلی کے پرجوش مقلد ہیں، انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) کے اکثر کارکن (جن میں مولوی عبدالحق کے علاوہ سلیم اور ہاشمی فریدآبادی کے نام خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) حالی کے پرخلوص معتقد ہیں۔ اگرچہ حالی کے لئے زمانے نے شبلی کی مشہور یادگاروں کی طرح کوئی اکیڈیمی نہیں قائم کی لیکن نہایت مسرت کا مقام ہے کہ وہ نا انصاف بھی نہیں ثابت ہوا۔

علاوہ ایک مخصوص ذہنیت اور ذوق ادب کے عبدالحق اور سلیم کا اسلوبِ بیان فی الجملہ حالی کی طرزِ انشا پردازی سے ملتا جلتا ہے۔ کسی ادیب کی زبردست کامیابی یہ ہے کہ وہ اپنی خداداد دوربینی کے ذریعہ سے مستقبل قریب میں اپنے ملک اور ادبیات کے جو رجحانات ہوں گے۔ ان کا صحیح اندازہ قائم کرلے اور پھر اس کے مطابق اپنے کارناموں کی تخلیق کرے۔ حالی نے اس قسم کی تخلیق کی ابتدا کی اور مولوی عبدالحق اور پروفیسر سلیم نے اس کو اختتام تک پہونچا دیا۔

عبدالحق کا اسلوب بیان حالی سے زیادہ شگفتہ معلوم ہوتا ہے حالی کو بعض بعض جگہ انگریزی کا کوئی خیال ظاہر کرتے وقت یا کسی عام خیال کو انگریزی اسلوب میں پیش کرنے کے لئے اپنی عبارت میں تعقید پیدا کرنی پڑتی تھی۔ اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خیالات کی گراں باری

سے مغلوب ہوئے جارہے ہیں۔ برخلاف اس کے مولوی عبدالحق اگر انگریزی کے ادق سے ادق خیال کو بھی اردو کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں تو اس قدر شگفتگی اور سادگی پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ خالص اردو معلوم ہونے لگتا ہے وہ کہیں کہیں اپنے کسی ایک ہی خیال کو تین تین چار چار بلکہ بعض دفعہ اس سے زیادہ ہم معنی مگر مختلف طرز کے خوبصورت جملوں کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں جن کی وجہ سے پڑھنے والے کو نہ صرف اس خیال کی اہمیت معلوم ہو جاتی ہے بلکہ ایک خاص قسم کی ادبی حلاوت بھی حاصل ہوتی ہے۔

اگرچہ سلیم کا قلم بھی انشا پردازی کے اس گر سے ناواقف نہیں ہے۔ لیکن ان کی ولولہ خیز طبیعت اور پرجوش ذہنیت نے ان کے اسلوب میں ایک خاص انفرادی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ وہ کارلائل کی طرح جو کچھ لکھتے ہیں متاثر ہو کر لکھتے ہیں۔ ان کی قلبی واردتیں اور ذہنی حالتیں اکثر دفعہ الفاظ کے حجابوں کو چیرتے ہوئے بے نقاب ہو کر نکل پڑتی ہیں۔ ایک آزادہ رو انشا پرداز ہونے کے باوجود وہ کارلائل کی طرح زبان کا خون کرنا کبھی پسند نہیں کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے اسلوب بیان کے فطری جوش میں جامعہ عثمانیہ حیدرآباد سے متعلق ہونے کے بعد سے ایک خاص تغیر ضرور پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن پھر بھی بہ نسبت مولوی عبدالحق کی تحریروں کے ان کی عبارتیں زیادہ جوشیلی ہوا کرتی تھیں۔

عبدالحق کی نظریں جب کسی چیز پر پڑتی ہیں تو وہ صرف اس کے سنجیدہ اور علمی پہلو پر پڑتی ہیں۔ سلیم ایک شاعرانہ طبیعت رکھنے والے انشا پرداز ہیں۔ ان کی نگاہوں میں کسی چیز کا صرف علمی پہلو ہی نہیں آتا بلکہ اس کی شعری کیفیتیں بھی ان کے آگے خود کو بے حجاب کر دیتی ہیں۔ اس حیثیت سے وہ اردو کے اسکر وائلڈ ہیں۔ ان کی نگاہوں میں لفظوں کی قدر و قیمت بالکل مستقل ہوتی ہے۔ ان کے ذہن میں رسکن کی طرح ہر لفظ ایک خاص معینہ معنی کے ساتھ داخل ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ان کے بیان میں تکرار نہیں پائی جاتی۔ بایں ہمہ ڈی کوینسی کی طرح ان کا لفظی مخزن نہایت وسیع ہے شاید ہی اردو کا کوئی ادیب ہوگا جس کے ذہن میں لفظوں کے پرے کے پرے اس قدر کثرت کے ساتھ ہر وقت موجود رہتے ہوں۔

عبدالحق جب کسی فضا میں قدم رکھتے ہیں تو اس کی وسعت اور پورے ماحول پر ان کا ذہن حاوی ہو جاتا ہے۔ برخلاف اس کے سلیم جب اسی فضا میں داخل ہوتے ہیں۔ تو اگرچہ ان کو اس کی بسیط کائنات اور وسعت حدود کی پروا نہیں ہوتی۔ لیکن وہ اس کی جملہ عمیق گہرائیوں یہاں تک کہ اس کے ایک ایک ذرہ کی ماہیت سے تفصیل وار روشناس ہو جاتے ہیں۔

سلیم کا اسلوب بیان سادگی ادا اور سنجیدگی کے لحاظ سے اگرچہ ان کے ہم وطن حالی کے اسلوب سے بہت کچھ مشابہ ہے

لیکن ان کی تحریروں میں آزاد کا جوش اور اثر پذیری کی کیفیات بھی جگہ جگہ اپنی جھلکیاں دکھاتی رہتی ہیں۔ اسی طرح اگرچہ عبدالحق فی الجملہ حالی کے پیرو ہیں۔ لیکن ان کی طرز انشا پردازی رنگینی اور شگفتگی کے باعث علامہ شبلی کے پیرایہ بیان سے بھی کہیں کہیں ہم آہنگ ہو جاتی ہے

پرفیسر سلیم کے طرز تحریر کے نمونے۔

(۱) عقلی اور دماغی قوتوں سے صحیح طور پر کام لینا بھی اس بات پر موقوف ہے کہ انسان کا جسم تندرست اور توانا ہو۔ جن لوگوں کے جسم توانا اور تندرست نہیں ہیں۔ ان کی تمام قوتیں آہستہ آہستہ دھیمی پڑ جاتی ہیں اور عقلی اور دماغی قوتوں کی چمک دمک باقی نہیں رہتی شگفتگی اور زندہ دلی اسی جسم میں رہ سکتی ہے جو تندرست ہو اور چستی اور ہوشیاری اسی بدن میں ہو سکتی ہے۔ جس میں خون اپنی قدرتی رفتار پر گردش کر رہا ہو” .... (ریاضت جسمانی معارف)

(۲) اگر تم دولت کی قدر قیمت معلوم کرنی چاہتے ہو تو اس کی آسان ترکیب یہ ہے کہ تم کسی سے قرض نہ لو اس تجربہ سے تم یہ جان جاؤ گے کہ جو شخص کسی سے قرض لیتا ہے وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو جاتا ہے۔ اگر تم اپنے سوا اور کے مقروض ہو تو یقین کرو کہ تم اس کے غلام ہو۔ ہر ایک روپیہ جو تم اپنے ہمسایہ سے قرض لیتے ہو وہ تمہاری ذاتی شرافت اور

آزادی کی قیمت ہے جس کے عوض میں تم نے اس شرافت اور آزادی کو دوسرے کے ہاتھ گرد کر دیا ہے ۔ افلاس انسان کی دلیری اور آزادی کو ملیامیٹ کر دیتا ہے ۔ غور کرو کہ خالی تھیلی جس میں روپیہ نہیں ہے فرش پر سیدھے کھڑی نہیں ہو سکتی ۔

(قرض)

مولوی عبدالحق کی طرزِ تحریر کے نمونے ۔

(۱) "غالب کا کلام ایک لازوال نعمت ہے ۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ۔ اس کی قدر اور بڑھتی جاتی ہے ۔ جب تک اردو زبان زندہ ہے ۔ اس کے زندہ رہنے میں کلام نہیں ۔ اگر یہ نہ بھی رہے تو بھی یہ کلام زندہ رہے گا ۔ کیونکہ اس کا کمال محض الفاظ اور زبان پر منحصر نہیں ۔ بلکہ ان قیود سے بالا و برتر ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی متعدد شرحیں لکھی جا چکی ہیں ۔ اور آیندہ سیکڑوں لکھی جائینگی اور فاضل شارح اس کلام کے سایہ میں اپنی جدت اور ذہانت کے دکھانے کے موقعے ڈھونڈیں گے ۔"

(تبصرہ رسالہ اردو)

(۲) "محسن الملک کے خطوں میں جوانی بے چینی اور تلون ہے ۔ اور وقار الملک کے خطوں میں بڑھاپے کی دانائی اور دوراندیشی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے۔

کہ محسن الملک ہمیشہ جوان رہے اور وقار الملک سدا کے بڈھے تھے۔ محسن الملک جذبات سے مغلوب ہو جاتے تھے۔ اور وقار الملک جذبات پر غالب آنے کی کوشش کرتے تھے۔ محسن الملک معاملہ کا رنگ بدلتا دیکھ کر مضطرب ہو جاتے اور ریشہ دوانیاں شروع کر دیتے اور وقار الملک معاملہ کو معاملہ سمجھ کر سکون کے ساتھ مقابلے کے لئے تیار ہو جاتے۔" تبصرہ

× یعنی اردو نثر فورٹ ولیم کالج تک ترقی کرتی رہی اور اس دور میں سیدھی
اپنی ترقی اس کالج کے نثر نگاروں کی [illegible] بیان
سے اردو نثر فورٹ ولیم ذہنوں میں بٹ جاتی ہے خود فورٹ ولیم کالج کے نثر نگاروں
میں دو رجحانات ملتے ہیں ایک تو سادہ اور سلیس جیسے میر امن کی نثر نگاری دوسرے
لطف [illegible] حیدری کی مقفی اور مسجع عبارت آرائی۔ اس کے بعد دونوں شاخیں
ترقی کرتی ہیں۔ ایک شاخ کو سرسید و غالب کے ہاتھوں علمی زمین ملنے کی وجہ
سے تناور درخت میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا پھل آج ہم کھا رہے ہیں۔ دوسری شاخ
کو دوسرے مصنف [illegible] علمی زمین میں [illegible] دیکھنے [illegible]
اور [illegible] جملوں سے [illegible] علمی [illegible]
علمی [illegible] زمین میں [illegible]
پھل سکی ہے

(۸)

اُردو نثر کے رجحانات

ارتقائے نثر اردو کے اظہار اور بعض مخصوص انشا پردازوں کے اسالیب پر ایک سرسری نظر ڈالنے کے بعد مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اردو اسلوبوں کے عام رجحانات کے متعلق گذشتہ مضمون کے خلاصہ کے طور پر مختصر سی بحث پیش کی جائے۔ اردو کے اسلوب بیان میں اب تک متعدد رجحان پیدا ہوتے رہے ہیں جن میں سے بعض کا ذکر ہم یہاں کرتے ہیں

۱

اردو نثر کی ابتدائی کوششوں سے فورٹ ولیم کالج کے ادبی کارناموں کے زمانہ تک اردو کا اسلوب تکلف اور تصنع میں شدت کے ساتھ ترقی کرتا چلا گیا اور غدر کے قریبی زمانہ کی اکثر کتابیں تو اس لحاظ سے معراج کمال پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اردو لکھنے والے

عام طور پر وہی تھے۔ جن کی مادری زبان فارسی تھی۔ اور دوسری یہ کہ اردو کی اکثر کتابیں یا تو فارسی کا بالکل ترجمہ تھیں یا کسی طرح سے اس پر مبنی تھی اس امر کے متعلق آزاد لکھتے ہیں۔

زبان اردو کے پاس جو کچھ سرمایہ ہے وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے۔ جنھوں نے فارسی کی بدولت اپنی دوکان سجائی ہے اس کی سرزمین کی ہوا اگر رہی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پردوں سے اڑی لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہ میں ڈوب کر غائب ہو گئی۔

اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور رہے مضامین عاشقانہ، گلگشت مستانہ، نصیبوں کا رونا، امید موہوم پر خوش ہونا امرا کی ثنا خوانی کبھی پر خفا ہوئے اس کی خاک اڑائی البتہ ان رنگوں میں اس نے لطافت، اور نازک خیالی کو یہاں تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔

فارسی میں صدہا نثر و نظم کی کتابیں ہیں جن کے خیالات باریکی و تاریکی عبارت میں جگنو سے لڑتے نظر آتے ہیں لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصل ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں ایسی ماں کا دودھ پی کر اردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا؟"

فارسی دانوں اور فارسی ترجموں کے اثر کے علاوہ اردو کے

اسلوب میں تعقید اور تصنع پیدا ہو جانے کی تیسری وجہ یہ تھی کہ (جس طرح اس مضمون کے پہلے ہی عنوان میں بیان کیا گیا ہے) زبان زباں دانوں کی رغبتوں کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ اور چونکہ پہلے پہلے اردو دانوں کا عام میلان مذہب کی جانب تھا اس لئے مذہب کے متعلق جس قدر الفاظ اور اصطلاحات عربی یا فارسی میں رائج تھیں ان سب کا اردو میں استعمال کرنا ضروری تھا۔ جن کے بغیر اس زمانہ کے انشا پرداز اپنے حقیقی مقاصد میں پوری طور پر کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن آخر کار یہ بھی ایک ایسا عنصر بن گیا جس کے باعث غدر کے قریبی زمانہ میں اردو نثر تعقید اور تکلف میں محصور ہو گئی۔

اگرچہ ارباب فورٹ ولیم کالج نے اس امر کی بوجہ احسن کوشش کی کہ اردو عربی و فارسی کی تقلید کے حلقہ مسموم سے آزاد ہو جائے اور اس کے اسلوب میں سادگی اور روانی پیدا ہو جائے لیکن اس وقت سوائے انہی کے ادبی کارناموں کے عام اردو تحریروں کا رنگ نہیں بدل سکا اس کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں اس قسم کی انشا پردازی کا مذاق شدت سے دل نشین ہو گیا تھا، اس وقت وہی ادیب کامل الفن سمجھے جاتے رہے تھے جن کے اسلوب میں زیادہ سے زیادہ رنگینی اور تکلف پایا جاتا۔ چنانچہ جب "انشائے بہار بے خزاں" میں۔ بہترین انشا پردازی کے نمونے

پیش کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا غلام امام شہید نے مسجع اور مقفیٰ ہی عبارتیں لکھکر پیش کیں - اور صرف یہی نہیں اگر اس زمانہ میں کوئی مصنف اپنی کتاب کو مقبول عام بنانا چاہتا تو وہ اس کو اپنے سے زیادہ مقفیٰ اور پر تکلف عبارتیں لکھنے والے ادیب سے لکھواتا تھا چنانچہ سرسید نے اپنی وہ مشہور کتاب جس کا نام "آثار الصنادید" ہے اول اپنے قلم سے نہیں لکھی بلکہ مولانا امام بخش صہبائی سے لکھوائی جو اس زمانہ کے مشہور فارسی داں تھے اور اردو میں مقفیٰ اور مسجع عبارتیں لکھا کرتے تھے - مرزا غالب بھی اگرچہ خطوط میں بالکل فطری اور نہایت سادہ زبان لکھتے تھے - لیکن زمانہ کے اقتضا سے مجبور ہو کر دیباچوں اور تقریظوں وغیرہ کو بالکل پر تکلف اور پر تعقید اسلوب میں قلم بند کرتے تھے -

اس وقت عام انشا پرداز سادہ اور صاف زبان استعمال کرنے کو معیوب سمجھتے تھے - جب میرامن باغ و بہار لکھتے وقت اسلوب بیان کی قدیم ڈگر سے ہٹ کر چلے اور فطری زبان استعمال کرنے کی کوشش کی تو بعض انشا پردازوں کو برا معلوم ہوا یہاں تک کہ مرزا رجب علی بیگ سرور اپنی کتاب "فسانہ عجائب" میں ان پر طعن کئے بغیر نہ رہ سکے -

قدیم طرز انشا پردازی سے اردو نویسوں کی ذہنیتیں اس قدر کثرت سے متاثر ہو چکی تھی کہ اب ان کا تبدیل ہونا کوئی آسان کام نہ تھا

چنانچہ آزاد جنھوں نے متعدد دفعہ اس رنگ کا مضحکہ اڑایا ہے۔ خود بھی اکثر عبارتیں اسی رنگ میں لکھ جاتے ہیں اور باوجود اس کے کہ وہ اپنی تحریروں میں متعدد بار کانٹ چھانٹ کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی مقفّیٰ اور پرانے اسلوب کی عبارتیں (جن کو وہ معیوب سمجھتے تھے۔) ان کی نظروں میں بہت کم کھٹکتی تھیں۔ اس قدیم طرزِ روش کا اثر اس قدر گہرا تھا کہ سنہ [illegible]ء میں جب ایک کتاب (بحر الفصاحت) فنون فصاحت و بلاغت اور عروض کے متعلق شائع کی جاتی ہے تو اس میں لفظوں اور معنوں کے لحاظ سے اردو نثر کی علیحدہ علیحدہ چار قسمیں کی جاتی ہیں۔ مثلاً باعتبار الفاظ اردو نثر کی حسب ذیل چار قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔

۱۔ مرجز ۲۔ مقفّیٰ ۳۔ مسجع ۴۔ عاری۔

۱۔ مرجز وہ نثر ہے جس میں وزن شعر ہو اور قافیہ نہ ہو مثلاً۔

"دیوانِ حقیقت کے مطلع کے ہیں دو مصرع، اک حمدِ الٰہی ہے اک نعتِ پیغمبر ہے، اس مطلعِ روشن کے، معنی منور سے ہر ذرہ بھی ہے واقف، سنتے ہیں ازل سے سب یہ مطلعِ نورانی، پر اس کے سوا اب تک اس ساری غزل میں سے اک شعر نہیں پایا"۔ آ نما غنی تقریظ انتخاب یادگار مولفہ امیر مینائی)

۲۔ مقفّیٰ وہ نثر ہے جو مرجز کے برعکس ہو یعنی جس میں قافیہ ہو لیکن وزن نہ ہو مثلاً

معشوق کی ہنسی پیشانی میں بوستان مسرت کی شان، عاشق کی جبیں گلستان

کے باب پنجم کا عنوان اس کی سرنوشت رنگین ہیں جس کا افسانہ اس کے سرخط گلزار میں عبارت عاشقانہ اس کی چوٹی بنفشے کا جواب اس کی زلفوں میں عشق کا پیچ و تاب" (جادۂ تسخیر)

(۴) مسجع وہ نثر ہے جس کے فقروں کے الفاظ وزن میں برابر ہوں اور حروف آخر میں بھی موافق ہوں مثلاً۔

پونڈا پھیکا اتنا بڑا کہ جس کی برائی بیان سے باہر ہے پونڈا میٹھا ایسا بھلا کہ اس کی بڑھائی گمان سے بڑھ کر ہے"۔ (دریائے لطافت)

پھر مسجع کی تین قسمیں قرار دی جاتی ہیں۔

۱۔ مسجع متوازی ۲۔ مسجع مطرف ۳۔ مسجع موازنہ۔

مسجع متوازی میں فقروں کے آخر دو لفظ وزن اور حرف آخر میں متفق ہوتے ہیں۔ جیسے۔ وقار۔ حصار۔ مثلاً

جس کوچہ و بازار میں جاتی وہاں سامان عیش مہیا پاتی" (گل بکاؤلی)

(ب) مسجع مطرف میں فقرے کے کلمات آخر وزن میں مختلف اور حرف آخر میں متفق ہوتے۔ مثلاً:۔

اگر حکم ہو تو چند روز کے واسطے ہم جنسوں کی صحبت میں جاؤں اور ان کے آب وصال سے اس آگ کو بجھاؤں (گل بکاولی)

(ج) مسجع موازنہ میں دونوں فقروں کے الفاظ آخر متفق ہوتے ہیں

لیکن آخر میں حروف مختلف ۔ مثلاً :۔

"دیکھ روح ایک جوہر لطیف ہے ۔ اور مجھ کو بہت عزیز" (توبۃ النصوح)

۴ نثر عاری، اس کے متعلق مصنف بحر الفصاحت تحریر فرماتے ہیں ۔

اس کے الفاظ میں نہ وزن کی قید ہے نہ قافیہ کی، یعنی ان سب باتوں سے عاری ہوتی ہے ۔ اور اس کو روزمرہ اردو بھی کہتے ہیں ۔ اور آج کل اردو میں اس قسم کی نثر بہت مروج ہے ۔

نثر کی قسمیں باعتبار معانی یہ ہیں ۔

۱۔ سلیس سادہ (۲) سلیس رنگین (۳) دقیق سادہ (۴) دقیق رنگین

۱ سلیس سادہ وہ نثر ہے جس کے معنی سہولت سے سمجھ میں آئیں اور جس میں مطلب بغیر رعایت مناسبات کے ادا کیا گیا ہو اس کی مثالیں عام ہیں ۔

۲ سلیس رنگین وہ نثر جس کے معنی سہل ہونے کے ساتھ ادائے مطلب میں مناسبات الفاظ کی رعایت ہوتی ہے ۔ مثلاً :۔

اس سال نیا ساز و سامان ہے ہولی شب برات، بہار سے دست گریبال ہے ۔ باغبانِ ازل فتنہ چمن نکالے گا ۔ بوٹا پتہ جوبن نکالیگا ۔ (فسانہ عجائب)

۳ دقیق سادہ وہ نثر جس کے معنی دقت سے سمجھ میں آئیں اور اس میں مطلب کو بدون رعایت مناسبات کے ادا کیا گیا ہو مثلاً

یہ مسلم ہے کہ لغت کا موضوع لفظ مفرد ہے۔ مفردات اصلی، مادے کی جستجو اشتراک لفظی یا معنوی، حقیقت یا مجاز بتانا اس کے عوارض ذاتی محل مبحث ہیں۔ لیکن اس کے موضوع کو جو متعلق غلطیوں سے مخلوط ہو کر خاص و عام کی زبان پر آتا ہے اس طور پر ملحوظ رکھنا کہ خالص زبان اور اس کے الفاظ اور متعلقات اضابیط ناگہاں سے الگ ہو کر ممتاز ہیں، یا بحث کے مقامات ان عوارض سے الگ ہوں جو عوارض ذاتی سے جدا اور اعراض غریبہ میں داخل یا اس کے متعین ہیں۔" (مولوی عبدالحق خیرآبادی۔ تقریظ امیر اللغات)

۳ دقیق رنگین وہ نثر ہے جس کی عبارت کے معنی بھی مشکل ہوں اور ادائے مطلب میں مناسبت الفاظ کی رعایتیں بھی ہوں مثلاً

بلندی مرتبہ کو لباس خاکساری میں ایسا چھپایا تھا جیسے گرد میں آسمان، رعونت تونگری کو لگدکوب فقر میں ایسا دبایا تھا جیسے زمین کے نیچے گنج شایگاں۔ اگر علم کا پاؤں قلعہ کوہ پر نہ پڑتا ہیچ کوہ گرانی بار سے پشت گاؤ زبان پر تکیہ کرتی اور علم کی آنکھ باریک بینی کی طرف متوجہ ہوتی کثرت معنی معنی وحدت کو صورت کثرت سے روشن مشاہدہ کرتی۔" (تذکرۃ الشعرا)

یہ تھی اردو نثر اور اس کے اسلوب کی ساری بساط جس پر قریب قریب انیسوی صدی کے آخری زمانہ تک ــــ اردو والوں کو فخر تھا۔

(۳)

اردو طرز انشا پر سادگی کا [illegible] رجحان پہلے اسلوب کے رد عمل کے ساتھ شروع

ہوتا ہے۔ اگرچہ اس کی ابتدا مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑوں میں جو کتابیں لکھی گئی تھیں ان ہی سے ہو گئی تھی۔ لیکن سرسید سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے پرانے اسلوب کے خلاف باضابطہ صدائے احتجاج بلند کی۔ اور محسن الملک حالی۔ آزاد۔ نذیر احمد اور شبلی سب سے پہلے انشا پرداز ہیں جنھوں نے صدائے لبیک کے ساتھ سرسید کے افکار کو اعمال کی شکل میں منتقل کر دیا۔

اردو زبان کے اسلوب کو فطری اور سادہ بنانے میں صرف انہی (متذکرہ بالا) بزرگوں نے کوشش نہیں کیں بلکہ اس بارے میں ان حضرات نے بھی نادانستہ طور پر مدد دی جو پہلے نہ صرف سادہ نگاری کو معیوب خیال کیتے تھے بلکہ خود اردو زبان میں کچھ لکھنا ذلت (اور شاید گناہ بھی؟) سمجھتے تھے۔ یہ بالکل سچ ہے کہ "اردو زبان فطرت کا ایک زبردست کرشمہ ہے" جس طرح اس مضمون کے چھٹے حصے میں بیان کیا گیا ہے کہ "تہذیب الاخلاق" اور سرسید کی مخالفتیں اسی صاف سیدھی زبان میں کیجاتی تھیں جو سرسید کے قلم سے اور تہذیب الاخلاق کے صفحوں پر پیش کی جاتی تھیں۔ اس مذہبی طوفان کا شروع ہونا تھا کہ اردو زبان کے سادہ اور فطری اسلوب بیان کی سرجیوں سوتیں اک دم ابل پڑیں۔ گویا ایک فوارہ تھا جو پہلے مقلدین اور غیر مقلدین کے جھگڑوں سے جاری ہوا اور ان کے فرد ہونے کے بعد رک گیا لیکن وہ اب پھر موقع ملنے سے پورے جوش و خروش کے ساتھ اچھلنے لگا تھا۔

اس طرح اردو خود بخود صاف سیدھی عبارتوں سے مالا مال ہونے لگی ۔

(۳)

جب سرسید کی تعلیم اور اپنے اپنے مذاق کے مطابق اردو کے سنجیدہ انشا پرداز ادبیات، تاریخ، فلسفہ وغیرہ ہر فن کو اس کے موزوں اسلوب کے ذریعہ فطری زبان میں پیش کرنے لگے تو اردو میں ایک اور صنعت اسلوب کا اضافہ ہوا اس کی وجہ یہ ہوئی کہ دہلی کے انشا پردازوں نے اپنے یہاں کی زبان اور لکھنو والوں نے اپنی زبان استعمال کرنی شروع کی جس کے باعث اردو کے اسلوب میں تفرقہ پیدا ہونا ضروری تھا۔ ان دونوں شہروں کی زبانوں میں اگرچہ کوئی بڑا اصولی فرق نہیں ہے لیکن ماحول اور تاریخی تغیرات کی بنا پر دونوں کے اسلوب میں کچھ نہ کچھ فرق ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ نذیر احمد، راشد الخیری اور ناصر نذیر فراق وغیرہ کی عبارتوں اور سرشار اور سودا وغیرہ کی تحریروں میں بہ حیثیت مجموعی ضرور فرق پایا جاتا ہے ۔

اس رجحان کا اثر یہ ہوا کہ اردو کے نثر نگاروں میں بھی شاعروں کی طرح فرقہ بندی پیدا ہو گئی بعض لوگ دبستان دہلی کی پیروی کرنے لگے اور بعض لکھنو کی لیکن یہ سب وقتیہ باتیں تھیں۔ اس قسم کے امتیازات رفتہ رفتہ اٹھتے جا رہے ہیں اور اگر اردو کو تمام ہندوستان کی عام زبان بننا ہے تو انھیں اور بھی سرعت کے ساتھ معدوم ہو جانا چاہیے ۔

۴

اردو کے اسلوب میں ترقی شروع ہونے کے بعد جس طرح فرقہ بندی کی طرف رجحان ہوا ایک اور نامناسب رغبت بھی رونما ہوئی اور وہ انگریزی الفاظ کا کثرت استعمال ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سرسید اور ان کے ساتھیوں ہی نے اس کی ابتدا کی اور یہ کوئی جرم بھی نہیں تھا۔ ہر زبان جب کہ وہ منازل ترقی میں گامزن ہوتی ہے۔ اس قسم کی خوشہ چینیوں سے ضرور بہرہ ور ہوتی رہتی ہے۔ لیکن بعض بدمذاق نثر نگاروں نے اس اصول سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہا اور انگریزی کے اکثر الفاظ اردو میں جا و بیجا استعمال کرنے لگے۔ صرف یہی نہیں ہوا۔ بلکہ انگریزی کے پرستاروں نے بحیثیت مجموعی اردو کے اسلوب بیان کو بھی انگریزی کا پورا پورا چربہ بنا دینا چاہا اور اس کو اردو کی ترقی کا بہترین ذریعہ سمجھ لیا اس طرح سرسید کے اثر سے اردو میں جو فطریت اور سادگی پیدا ہوگئی تھی وہ ابھی اچھی طرح نشو و نما کرنے نہیں پائی تھی کہ اس قسم کی رکاوٹیں پیدا ہونے لگیں۔

۵

انگریزیت کے رجحان کا ترقی پانا تھا کہ عربی و فارسی کے ماہرین کامل اور پرانی طرز کے انشا پردازوں میں ایک جوش پیدا ہوا اور انھوں نے اس نئے عنصر کے خلاف اس زور سے علم بغاوت بلند کیا کہ اردو کی رفتار

ترقی کو ایک زبردست صدمہ پہنچا۔

ردِ عمل کی یہ پرجوش کوششیں "الہلال" کے ذریعہ افق اردو پر نمودار ہوئیں اور اگرچہ اب الہلال باقی نہیں ہے لیکن اس کی روشنی سے اب تک دنیائے اردو کے بعض طبقے متاثر نظر آتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو[1] کو موجودہ حالت میں لانے کی جس حد تک یہ دونوں (یعنی عربی و فارسی) زبانیں ذمہ دار ہیں اس کا تقاضا ہے کہ اس میں عربی و فارسی کی آمیزش اسی نسبت سے ہونی چاہیئے" اور نیز یہ کہ اردو[2] کے مصحف حسن میں فارسی خد و خال، محض حسن کی اضافی حیثیات نہیں ہیں۔ اور اس کلیہ کو محض شاعرانہ حسن بیان پر محمول نہیں کرنا چاہیئے۔ پاکیزہ اردو جسے میں بلا خوف تردید ہندوستان میں وہی حیثیت دینا چاہتا ہوں جو فرنچ کو مغرب اور فارسی کو مشرق میں حاصل ہے۔ فارسی کے بغیر ایک جسد بے روح ہے" اس کے علاوہ عربی مشتقات اور مصادر اگر کام میں نہ لائے جائیں تو پھر اردو ایک بے مایہ زبان رہ جاتی ہے۔ عربی ترکیبیں بعض اوقات اردو کی بہت سی مشکلات دور کرتی ہیں"۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اردو کو بالکل ناقابل فہم بنا دیا جائے یا کم از کم یہ ہو کہ اس کو صرف مسلمانوں کے لئے مخصوص کر دیں۔

---

[1] و [2] زبان اردو پر سرسری نظر از مولوی رشید احمد صاحب صدیقی۔

کیا حسب ذیل اسلوب بیان اردو کی ترقی کا ذمہ دار ہو سکتا ہے؟ "احتیاج نوم" کے عنوان کے تحت لکھا جاتا ہے۔

"حالت نوم میں روح نفسانی رجوع و اجتماع الباطن میں پیروی نفس کرتی ہیں ٹھیک اسی طرح جیسا کہ حرکات اجسام لطیفہ منارجہ میں ہوتا ہے۔ جب وہ بہ ضرورت تھلا ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ اور اس وقت میں وہ ترکو تسبیح ہو جاتی ہے جو بیداری میں تحلیل ہو گئی تھی اور ابخرہ رطب غلیظہ ذہنیہ دماغ کی طرف اٹھ جاتے ہیں اور اس سبب سے اعصاب ڈھیلے اور نرم ہو جاتے ہیں۔ بوجہ اس انطباق کے باطن سے خارج کی طرف روح کا نفوذ اعصاب میں نہیں ہوتا ہے۔ اور کثافت انحراف مانع نفوذ ہوتی ہے۔ کیونکہ نفوذ روح با اعصاب حسب تشریح جالینوس مثل نفوذ شعاع شمس فی الہوا و الماء ہے۔"

جب مسلمان انشا پردازوں نے قدیم لغتوں سے عربی و فارسی کے دقیق ترین الفاظ نکال نکال کر لانے شروع کیے تو ہندوؤں کا خاموش رہنا ناممکن تھا۔ انھوں نے بھی سنسکرت اور بھاشا کے مشکل اور نامانوس لفظوں سے اردو والوں کی ضیافت شروع کی پھر کیا تھا اردو بجائے ترقی کرنے کے دو متعصب اور ضدی طبقوں میں تقسیم ہو کر تباہ ہونے لگی اور یہ عمل اگرچہ اس وقت تک جاری ہے۔ لیکن اس کلیہ کے مطابق

کہ فطرت خود اصلاح کی طرف راغب ہے اس کی شدومد میں رفتہ رفتہ کمی ہوتی جارہی ہے۔

۶

صرف ہندوؤں ہی نے عربی اور فارسی کے الفاظ اور ترکیبوں کی مخالفت نہیں کی بلکہ اکثر سنجیدہ مسلمان انشا پرداز بھی اس کے ردعمل کی کوشش کررہے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض حد سے متجاوز بھی ہو جاتے ہیں۔

عربی و فارسی ترکیبوں کی مخالفت کا رجحان بعض انشا پردازوں کو صرف اسی خیال کی وجہ سے نہیں پیدا ہوا بلکہ اس کا ایک اور مہیج بھی تھا اور وہ جامعہ عثمانیہ کے دارالترجمہ کے لئے وضع اصطلاحات کا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے متعلق پروفیسر وحیدالدین سلیم نے ایک کتاب "وضع اصطلاحات" لکھی۔ جس میں حسب ذیل تین امور پر مفصل بحث پیش کی گئی ہے۔

۱ - وضع اصطلاحات کے دو مختلف نظریے ہیں جن میں سے ہر ایک کا ماننے والا ایک بڑا گروہ ہے۔

۲ - اردو زبان جس خاندان السنہ سے تعلق رکھتی ہے۔ ان میں الفاظ سازی کے جو مشترک اصول ہیں ان کا بیان۔

۳ - ہماری زبان میں ترکیب استعمال کے کون کون سے طریقے پائے جاتے ہیں

یہ رجحان نہایت معرکتہ الارا ہے۔ اس کے متعلق آئندہ بھی بحث کیجائیگی۔

(ے)

آج کل اردو اسلوب کا ایک خاص رجحان لطیف نگاری کی طرف ہے یہ رجحان مولانا ابوالکلام کی طرز انشا پردازی اور سر رابندرناتھ ٹیگور کی نظموں کے مترجمہ اردو اسلوب کے عناصر سے مرکب ہے۔ اگرچہ ہر ترقی یافتہ زبان میں اس قسم کی طرز تحریر کا کبھی نہ کبھی پیدا ہونا لازمی ہے لیکن ابھی اردو پوری طرح اس قابل نہیں ہوئی تھی کہ اس میں اس قسم کی انشا کثرت کے ساتھ رواج پاتی۔ اردو کو سنجیدہ نگاری اور علمی مضامین میں ابھی بہت کچھ ترقی کرنی ہے۔ اور افسوس ہے کہ بہت پہلے ہی اس میں اس نوع کا اضافہ اور وہ بھی حد اعتدال سے زیادہ ہونا شروع ہو گیا۔ اس کی کثرت استعمال کے اسباب ہم نے اس مضمون کے گزشتہ باب میں بیان کر دئے ہیں۔

جناب اصغر (گونڈہ) نے اس کا ایک نفیس نقشہ اپنے ایک مضمون میں (جو انجمن اردوئے معلی مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے استفسارات کے جواب میں لکھا گیا ہے) پیش کیا ہے۔ ہم یہاں اس کے بعض جملے بطور اقتباس نقل کرتے ہیں۔ جن سے اس رجحان کے متعلق کافی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں

> ادب لطیف کا اصلی مفہوم اس لطیف طرز انشا سے ہے جو وسعت علم احساس شعریت و حکیمانہ نزاکت خیال کے باہمی امتزاج سے پیدا ہوتا ہے جس طرح پانی کے تلاطم و روانی سے خود بخود موجیں نمایاں ہو جاتی ہیں۔

اسی طرح علم و فن کے نشر و ترقی سے "ادب لطیف" بھی آپ سے آپ عالم وجود میں آتا ہے۔ اردو زبان کی موجودہ وسعتوں کو دیکھتے ہوئے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ادب لطیف کا وجود کچھ قبل از وقت ہو گیا لیکن اس کی بہتات و فراوانی سے یہ اندیشہ ضرور ہے کہ کہیں یہ بھی اردو کی تکمیل میں سد راہ نہ ہو۔ اس لئے کہ زبان کا اصلی وقار اس کے سنجیدہ سرمایہ علمی سے ہے نہ کہ صرف خوبصورت و لطیف طرز انشائے لطیف طرز ادا کا شمار اغراض میں ہے اور ظاہر ہے کہ اصل و اغراض میں حق مرجح کس کا ہے۔ لیکن یہ بحث تو ایک طرف میں تو باستثنائے چند حضرات کے یہ سمجھتا ہوں کہ اردو میں "ادب لطیف" کا مفہوم ہی ابھی عام طور سے نہیں سمجھا گیا۔

ادب لطیف کے نام سے چونکہ ہر قسم کی بے راہ روی و مطلق العنانی کا بھرم قایم رکھا جا سکتا ہے۔ اس لئے اکثر نوجوان کا میلان طبع اسی طرف ہوتا جاتا ہے۔ اور غالباً اسی لئے ادب لطیف کا اہم ترین موضوع فکر بھی "عورت" ہے . . .

ادب لطیف کا تقاضا یہ ہے کہ خواہ کسی موضوع پر بحث ہو مگر فکر و نظر کی جو تابانیاں کامل سنجیدگی کے ساتھ بھی حسن نسوانی ہی پر جا کر دم لیں۔ "زہر عشق" و "بہار عشق" وغیرہ میں قدامت و ابتذال

پیدا ہو گیا تھا۔ مگر جب اس حقیقت پر فلسفہ حسن و عشق کا شفاف فانوس چڑھ گیا تو پروانگی اور خیرہ نگاہی کا پھر وہی عالم ہو گیا۔ جو پہلے تھا۔ ادب لطیف کے اور زلزلہ افگن و صاعقہ پاش تراکیب کے ہنگاموں میں کون کس کی سنتا ہے۔ ...... بعض نوجوان اس خوبصورت گناہ کو حسن خیال کرتے ہیں۔ یہ الفاظ کی سحر کاریاں ہیں کہ جب چاہا اور جہاں سے چاہا حقیقتوں کا منظر تبدیل کر دیا۔ شور یہ ہے کہ یہ آرٹ ہے۔ اس لیے کے خوش مذاقی شرط ہے مگر کوئی چپکے سے کہتا ہے کہ جی نہیں فسق و بزدلی بھی اس کے ضروری عناصر ہیں۔ الغرض یہ "حسن مذاق" یہ ارتعاش رنگین "یہ آشوب خیال" مع اپنے گاڑھے گاڑھے آفت سامانیوں کے ادبی و معاشرتی زندگی میں اس قدر رچ گیا ہے کہ اب اس سے عہدہ برآ ہونا محال نظر آ رہا ہے ...... الآخرہ (سہیل جنوری سنہ ۱۹۲۶ء ص ۱۰۰ تا ۱۲۰

۸

اردو کے موجودہ اسلوب میں جس قدر اہم میلانات پائے جاتے ہیں ان کا ہم نے کم و بیش تذکرہ کر دیا ہے لیکن اس میں ایک مخصوص رجحان کا ذکر باقی رہ گیا ہے۔ جو غدر کے بعد ہی سے شروع ہو گیا تھا جس طرح ہم نے پہلے بھی اس امر کا اظہار کر دیا ہے کہ زبان ایک ٹریڈیشنل شئے ہے، مصنوعی ہرگز نہیں۔ وہ خود بخود بدلتی اور بگڑتی رہتی ہے۔ اور ہر اہم واقعہ اس میں

ایک انقلاب پیدا کر دیتا ہے۔ جب اہل زبان کے مذہب میں کوئی انقلاب ہوتا ہے تو ان کی زبان میں بھی مذہب کے متعلق خود بخود الفاظ پیدا ہونے لگتے ہیں۔ مثلاً کرامات، صلوٰۃ، نماز، ورد وغیرہ الفاظ جو مذہبیت کے اثر سے پہلے عربی میں اپنے لغوی اور معمولی معنوں کے ساتھ مستعمل تھے آج خاص اصطلاحیں بنے ہوئے ہیں۔

جب ایران پر عربوں کا تسلط ہو گیا تو ایران کی ہر چیز میں انقلاب پیدا ہو گیا اور سب سے پہلے تو زبان ہی پر اس کا اثر پڑا۔ چنانچہ ایران کی زبان جو پہلوی سے مشتق تھی، عربی کے اثر سے بالکل بدل گئی۔ یہاں تک کہ ایک صدی کے بعد پہلوی زبان کا سمجھنا خود ایرانیوں کے لئے دشوار ہو گیا۔ زبان کا یہی فطری تغیر و تبدل ہے جس نے لاطینی زبان کو موجودہ اطالوی اور ہسپانوی زبانوں کی شکل میں منتقل کر دیا۔

اگر ہندوستان کی سیاسی حالت پر غور کریں تو اردو زبان کی نشو و نما اور اس کے اسلوب بیان کے تغیر و تبدل کے متعلق کافی تحقیقات ہو سکتی ہیں۔ اردو زبان کے پیدا ہونے کے بعد جب دکن کے غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دینی ضروری سمجھی گئی تو مذہبی الفاظ اور اصطلاحات خود بخود اردو میں رائج ہونے لگیں۔ نیز اردو کے اسلوب میں متانت، خوبی تفہیم اور دینی رنگ جھلکنے لگا۔ اس کے بعد جب دکن میں اسلامی سلطنتیں قائم

ہوگئیں اور اردو کو بادشاہی اور امرائی درباروں میں (جو ہر لحاظ سے ایران کے مقلد تھے) باریابی ہونے لگی اور فارسی سے ترجمے کئے جانے کی فرمائشیں کی گئیں تو اردو کا فارسی سے متاثر ہونا ایک فطری بات تھی چنانچہ وہ اسی سمت ترقی کرنے لگی اور فارسی اسلوب کا تکلف، رنگینی اور تعقید اردو میں بھی روشناس ہوگئی۔

جب اردو کا تعلق حکومتوں اور درباروں سے منقطع ہوگیا اور فارسی سے براہ راست اسے کوئی لگاؤ نہ رہا تو اس کا نہج خود بخود روبہ اصلاح ہوگیا اور خصوصاً جب فورٹ ولیم کالج کے علم دوست انگریزوں نے اس کی طرف توجہ کی تو اس میں آزادی اور سادگی کی باضابطہ ابتدا ہوگئی۔ اس کے بعد جب اہل حدیث کے مذہبی جھگڑے شروع ہوئے تو پھر مذہبی الفاظ و مصطلحات کا احیاء ہوا۔ آخرکار جب دنیائے اردو پر انگریزی سلطنت مسلط ہوگئی اور اس کے بعد سرسید وغیرہ کے اثر سے ہندوستان میں تعلیمی سرگرمی پھیلنے لگی تو اس کے ساتھ ہی تعلیم کے متعلقہ الفاظ مثلاً تعلیم یافتہ، مطبع، اخبار، اشتہار، لیتھو وغیرہ فطری طور پر پیدا ہونے لگے۔ اور ساتھ ہی اردو کے اسلوب میں سنجیدگی، علمیت اور ادبی شان کا اضافہ ہوگیا۔ نیز انگریزی اسلوب کا اثر بھی اردو تحریروں میں نمایاں ہونے لگا۔ جب پہلے پہلے ہندوستان میں انگریزی قانون رائج ہوا اور اردو میں اس کے ترجمے ہونے لگے تو

ہزار ہا قانونی الفاظ رائج ہو گئے۔ مثلاً "مستغیث، سمن، ازالہ حیثیت عرفی وغیرہ اور غالباً خود لفظ قانون کا مفہوم اسی زمانہ کی پیداوار ہے۔ اسی طرح اخباری دنیا میں انگریزی اخباروں کی ایمانداری کے ساتھ ترجمانی کرنے کے لئے ضروری تھا کہ خاص خاص۔ اصطلاحوں کے لئے اردو میں الفاظ گھڑنے کے علاوہ اسلوب بیان میں بھی تبدیلی کی جائے۔ غرض جب سے سیاست کا اثر ہندوستانیوں کی ذہنیتوں پر پڑنا شروع ہوا ہے۔ اسی وقت سے اردو کے رنگ میں سیاسی رنگ جھلکنے لگا تھا۔ لیکن ظفر علی خان سب سے مشہور انشا پرداز ہیں جنہوں نے سیاسی تحریروں کے لئے ایک مخصوص اسلوب اختیار کیا۔ اگرچہ بظاہر یہ ایک تفریح طبع کا سامان بھی ہے لیکن اس کے ذریعہ سے ارباب حل و عقد بڑی بڑی کام کی باتیں کر جاتے ہیں آج کل یہ "ملا رموزی" کا جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ ہر سر برآوردہ قومی یا ملکی واقعہ "ملا رموزی" پر تازیانہ کا کام کرتا ہے۔ جس کے بعد وہ اپنا قلمی "تنبیہ الغافلین" سنبھالے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ملا رموزی کی طرز تحریر کے نمونے۔

بس آل انڈیا نیشنل کانگریس کانپور کے قل سے فراغت ہوئی تو وطن واپس ہونا دوبھر ہو رہا تھا۔ اور چشم تماشہ طلب کو "کسی مجمع" کی تلاش میں جب جمائیاں آنے لگیں تو کانپوری میزبان کی اجازت کے بعد پوری

آن بان سے بستر کو ایک لکڑی میں لٹکا کر کاندھے پر رکھ سائس جورو کا تو کانپور کے بڑے اسٹیشن پر جا پہونچے اور پوری عجلت سے بستر فرسٹ کلاس ویٹنگ روم کے سامنے رکھدیا تاکہ رخصت کرنے والے احباب اور احبابیات سمجھیں کہ ہم فرسٹ کلاس میں سفر کرنے والے ہیں۔ اتفاق سے آج مسافروں کی بڑی کثرت تھی۔ جب ہم نے "بابو جی" سے فرسٹ کلاس ٹکٹ مانگا تو انھوں نے کہا کہ آپ دیر میں آئے اس لئے فرسٹ اور سکنڈ کے ٹکٹ تو فروخت ہو گئے۔ البتہ تھرڈ کلاس کے کچھ ٹکٹ امانتاً میرے پاس ہیں"۔ (علی گڑھ جبلی)

(۲) اگر بدظنی اور بدگمانی میاں مجنوں اور سماۃ لیلیٰ بی تک ہی محدود رہتی تو چنداں مضائقہ نہ تھا کہ اس کے پیدا ہو جانے سے طالب و مطلوب میں ایک "خونریز جنگ" یا ایک "لطیف جھجک" پیدا ہو جاتی ہے بلکہ شعرائے اردو نے تو محبوب کی اس بدگمانی کو طالب کے لئے معراج کا درجہ عطا فرمایا ہے۔ جو اسے اپنے طالب سے اس طرح ہو جائے کہ وہ سمجھے کہ اب میرا طالب کسی دوسرے کا طالب ہے" لیکن خدا بچائے اور بصیغہ توری بچائے اس بدگمانی سے جو ایک ایڈیٹر اور ایک مضمون نگار کے درمیان پیدا ہو جائے۔ (زبان خلق رسالہ زبان جلد نمبر (۱) (۳)

اگرچہ یہ اسلوب وقتی ضرورتوں کے لحاظ سے اختیار کیا گیا تھا اور ایک زمانہ تک ان ہی کے لئے مخصوص رہا لیکن اس کا اثر سنجیدہ انشا پردازی پر بھی بہت کچھ پڑا۔ چنانچہ بعض حضرات کی تحریروں

میں اس کی جھلکیں کہیں کہیں ضرور نمودار ہو جاتی ہیں۔ خاص کر ایسے ادیبوں کا اس سے متاثر ہوئے بغیر رہنا ناممکن تھا جن کی طبیعتوں میں ظرافت ذہنیتوں میں اپج اور مذاق میں نفاست پائی جاتی ہو۔

اس ضمن میں رشید احمد صدیقی اور عظمت اللہ خاں دہلوی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں ان دونوں کی تحریروں میں ظرافت، اپج اور چوچلے کے علاوہ ایک خاص قسم کی سنجیدگی بھی پائی جاتی ہے۔ دونوں کی نظریں جب کسی چیز پر پڑتی ہیں تو اس کے ایک ہی قسم کے پہلو پر پڑتی ہیں دونوں ٹھیٹ علمی اور سنجیدہ مضامین پر بحث کرتے وقت بھی اپنی طبعی شگفتگی اور ظرافت کو پوری طرح سے برقرار رکھتے ہیں۔ اور پھر کمال یہ ہے کہ ملا رموزی بھی ہنسنے پلاتے "مُلّا رموزی" اگرچہ بڑے بڑے واقعات پر قلم فرسائی کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تحریریں صرف وقتی دلچسپی رکھتی ہیں۔ برخلاف اس کے ان دونوں کی تحریروں میں دوامیت پائی جاتی ہے۔ دونوں اپنی عبارتوں میں محاوروں اور ضرب المثلوں کے علاوہ مشہور مصنفین کے مشہور ترین اقوال اور اشعار استعمال کرتے ہیں اور اس لطف کے ساتھ استعمال کرتے ہیں کہ وہ محاورہ ضرب المثل یا شعر اپنی ذاتی خوبی سے دس گونہ زیادہ دلچسپ بن جاتا ہے۔ ان دونوں کی انشا پردازی پر انگریزی کا بہت گہرا اثر پڑا ہے لیکن انگریزی کے دوسرے مقلدوں کی طرح ان کی تحریروں میں گنجلک

نام کو نہیں پیدا ہونے پاتا ۔

یہاں تک تو ان دونوں کے اسلوب میں یکسانیت پائی جاتی ہے ۔ لیکن اس کے بعد ان میں فرق پیدا ہو جاتا ہے ۔ رشید احمد صدیقی کی تحریروں میں عربی و فارسی کا زیادہ اثر پایا جاتا ہے ۔ اور عظمت اللہ خان کی اکثر عبارتیں ہندی بھاشا کے مشتقات سے بھرپور ہوتی ہیں ۔ اول الذکر علامہ شبلی کے دبستان کے پیرو نظر آتے ہیں اور موخر الذکر خواجہ حالی کے متبع ۔ رشید احمد صدیقی کی عبارتیں ظاہر کرتی ہیں کہ ان کا لکھنے والا الیبان کے فلسفہ اجتماعیات کے جملہ اسرار سے واقف ہے ۔ وہ اپنے مخاطب کو ہر طرح سے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہے ۔ اور جب دیکھتا ہے کہ اس کا مخاطب خوشامد درآمد سے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تو نفسیاتی اثر سے اپنا مقصد حاصل کر لیتا ہے عظمت اللہ خان کی تحریریں ظاہر کرتی ہیں کہ ان کا مصنف پہلے خود اس طرح متاثر ہو لیتا ہے کہ اس کا اثر دوسروں پر فطری طور پر پڑنے لگتا ہے ۔ وہ خود مگن رہتا ہے اور ساتھ ہی دوسروں کو بھی نچنت بیٹھنے نہیں دیتا ۔ اور آخر کار اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے ۔

عظمت اللہ خاں کی طرز تحریر کے نمونے ۔

> اس میں کوئی شک نہیں کہ ایجاد بندہ بیشتر گندہ بھی ہوتی ہے ۔ اور بہت ممکن ہے کہ زمانہ اس عروضی نظام کو جو اس مضمون میں پیش کیا گیا ہے

خشکہ پاگندہ بروزہ" ثابت کرے لیکن راقم کا جی زمانہ کی اتنی عنایت چاہتا ہے کہ یہ عروضی اصول اور طریقے تجربے کی کٹھالی میں ڈالے جائیں اور پھر کھرے یا کھوٹے طے پائیں۔ یہ نہ ہو کہ بے توجہی کے کھاتے میں قدامت پسندی بغیر آزمائش کے پھکوا دے یا بلا جانچ پڑتال کیے انسان کی عمر عیار والی زنبیل کے حوالہ کر دے۔" (شاعری)

۲ اصلی کتاب کا کیڑا ان سب سے انوکھا ہوتا ہے۔ وہ کتاب کو اپنی جان سمجھتا ہے۔ اگر کتاب اس سے تنہا کر دی جائے تو پھر یہ بے چارہ کچھ نہیں۔ وہ کتاب کا عاشق ہوتا ہے۔ کتاب کی صورت اور سیرت کا اس کی محبت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ بھونڈی سے بھونڈی اور موہنی سے موہنی کتاب اس کی نظروں میں یکساں ہوتی ہے۔ صدیوں عمر والی اور جدید سے جدید دوشیزہ اشاعت دونوں پر اس کا دل لوٹ کے آتا ہے (کتاب کے کیڑے)

رشید احمد صدیقی کی نثر۔

اس لیے کہ ہمارے خدایان مجازی ہماری ہر التجا پر صرف ایک فیصلہ صادر کر سکتے ہیں جو کسی اجنبی اور معصوم شخص کے سامنے ایسی دل خوش کن نظیر پیش کر سکتا ہے کہ وہ بیچارہ عالم خود فراموشی میں رقص کرنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ لیکن یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ جب یہ گز زمین کے حصہ کی نعمتیں ازل میں تقسیم ہو رہی تھیں، اس وقت ہم ان بزرگوں کے سامنے دست التجا

پھیلائے ہوئے تھے جن کا کمیشن ان مراعات کے خلاف نوٹ آف ڈسنٹ لکھ رہا تھا۔" (علی گڑھ میگزین فروری ۱۹۳۱ء۔

۲ "مجھے جو کچھ عرض کرنا تھا، وہ کر چکا۔ آپ نے جس صبر و شکر کے ساتھ میرے خیالات کی پذیرائی فرمائی ہے۔ اس کا شکر گذار ہوں اور خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اب کوئی ایسا موقع نہ آئے جہاں میری جسارت اور آپ کے ضبط و تحمل کو یوں معرض امتحان میں لایا جائے۔ صرف ایک چیز باقی رہ گئی ہے۔ جس کا میں نے عمداً کہیں تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اور وہ یہ کہ کہنا سننا تو ہمیشہ رہا ہے اس سے حاصل ہی کیا کچھ کیجئے بھی۔ جس اندیشہ سے میں نے اس کلام کا کہیں تذکرہ نہیں کیا وہ آپ پر روشن ہے ؎

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اٹھا اور اٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لئے"

(زبان اردو)

یہ دونوں اسالیب اردو زبان میں عظیم الشان اضافے ہیں یہی وہ آثار اور رجحانات ہیں جنہیں دیکھ کر امیدیں بندھتی ہیں کہ اردو زبان کا مستقبل نہایت شاندار ہے ورنہ بحیثیت مجموعی اگر موجودہ اردو نثر پر نظر ڈالی جائے تو کوئی دل خوش کن نتیجہ مرتب نہیں ہوتا اردو میں سیکڑوں

مضمون نگار اور انشا پرداز ایسے ہیں جو باوجود پختہ مشق ہونے کے طرزِ تحریر میں کوئی نئی بات نہیں پیدا کر سکے۔ جب اربابِ تصنیف و تالیف کا یہ حال ہو تو عام زبان دان اور معمولی تعلیم یافتہ طبقے کا کیا پوچھنا ! -

*

(۹)

اُردو نثر کا مستقبل

کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کرسکتی اور اس کا مستقبل شاندار نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ اس کے ادیب اسلوب بیان کی اہمیت سے کافی طور پر واقف نہ ہو جائیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو میں آئے دن نئے نئے موضوع اور معلومات پر کتابیں شایع ہوتی جا رہی ہیں اور کوئی مہینہ ایسا نہ ہوتا ہوگا جس میں کسی نئے رسالہ کا اشتہا نہ نکلتا ہو لیکن ان سب کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ اردو کے اسلوب میں کوئی شاندار اضافہ نہیں ہوا۔

صرف نئی نئی معلومات یا کتابوں کی کثرت سے زبان مہتم بالشان نہیں بنتی۔ اسی طرح جو انشا پرداز کثیر التصانیف ہے وہ اعلیٰ درجہ کا انشا پرداز نہیں ہو سکتا۔ انشا پردازی کا انحصار تصانیف کی کثرت پر نہیں ہے بلکہ انشا پردازی کی خوبی پر یوں تو وکٹر ہیوگو کے خیال کے مطابق دنیا کی ہر چیز ایک عنوان ہے لیکن وہ ایک ایسے صاحب کمال کی منتظر ہوتی ہے جو اس پر

قلم اٹھائے۔" اسی طرح ہربرٹ ایلس کہتا ہے کہ "جو کچھ دنیا میں ہوتا ہے بیان کیا جاسکتا ہے۔ لیکن ضرورت ایسے آدمی کی ہے جو اس کو بیان کرنا جانتا ہے" ہماری زبان میں صرف خواجہ حسن نظامی ایک ایسے انشا پرداز ہیں جو معمولی معمولی عنوانوں پر بھی وہ وہ پتہ کی باتیں لکھ جاتے ہیں جن کو کوئی بڑا فلسفی اور حکیم اپنے کسی عظیم الشان مقالہ میں مغلق الفاظ کے ذریعے سے بھی بدقت ظاہر کر سکتا ہے۔

"افسوس ہے کہ ہمارے نئے انشا پرداز خواجہ صاحب کے اس معنوی گر سے تو واقف نہیں ہوتے جن پر ان کی انشا پردازی کی عظمت کا دار و مدار ہے لیکن ان کے اسلوب کے ظاہری لوازمات کی نقل اتارنا چاہتے ہیں جس میں ان کی کامیابی اس وقت تک ناممکن ہے جب تک کہ وہ خواجہ حسن نظامی جیسا دل و دماغ نہ پیدا کرلیں اور ہر چیز کو اسی مخصوص زاویہ نگاہ سے نہ دیکھا کریں جس سے خواجہ صاحب دیکھتے ہیں۔

یہ کہنا کہ فلاں عنوان پر کامیاب مضمون لکھا جا سکتا ہے اور فلاں عنوان پر نہیں، بالکل غلط ہے۔ کامیابی کا انحصار مضمون پر نہیں بلکہ مضمون نگار پر ہے۔ وکٹر ہیوگو نے شاعری کے متعلق کہا تھا کہ "شاعری کے لئے کوئی مضمون اچھا اور کوئی مضمون برا نہیں ہوتا۔ بلکہ اچھے اور برے شاعر ہوتے ہیں لیکن یہ خیال نثر نگاری پر بھی صادق آسکتا ہے۔ اور ہم کہ سکتے ہیں کہ نثر نگاری کے لئے کوئی موضوع اچھا اور کوئی موضوع برا نہیں ہوتا بلکہ اچھے اور برے

نثر نگار ہوتے ہیں۔ اس خیال کو ٹنی سن نے اس طرح ادا کیا تھا کہ "قابل توجہ یہ بات نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔ بلکہ یہ کہ ہم کس طرح کہہ رہے ہیں" اور اسی لحاظ سے علامہ ابن خلدون نے الفاظ کو پیالہ اور معانی کو پانی قرار دیا ہے۔ پانی کو چاہو سونے کے پیالہ میں بھر لو چاہو مٹی کے لیکن سونے کے پیالہ میں اس کی قدر بڑھ جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ اختلاف ظرف سے پانی کی ماہیت میں فرق آجاتا ہے مثلاً سونے کے پیالے میں زہر اور مٹی کے پیالہ میں امرت ہو تو وہ خوش گوار و صحت بخش اور یہ ناگوار و تکلیف دہ ہوگا۔ جب آب شیریں سونے یا مٹی کے پیالہ میں ہو تو ہر دو حالتوں میں وہ شیریں ہی رہے گا البتہ ظاہری خوش نمائی اور دلآویزی میں تفاوت ہوگا۔ اور یہی ظاہری خوش نمائی و دلآویزی وہ زبردست عنصر ہے جس پر کسی تحریر کی ادبیت کا دار و مدار ہوتا ہے حالی نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ انشا پردازی کا انحصار جتنا الفاظ پر ہے معنی پر نہیں۔ معنی اور مطالب صرف الفاظ کے تابع ہیں اور ہر شخص کے ذہن میں موجود ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان مطالب کو بہترین طور پر ادا کرنا سیکھیں اور حتی الامکان اس بات کی کوشش ہو کہ معانی اور اصوات الفاظ میں ہم آہنگی رہے۔

آئرلینڈ کا مشہور مصور فطرت ڈبلیو، بی، ایٹس لکھتا ہے "ادب میں زبان کو بہ حیثیت زبان نہیں ملحوظ رکھا جاتا۔ بلکہ فن لطیف کی حیثیت سے

اور وہ فن لطیف جس کا ذریعہ اظہار زبان ہو ادب (لٹریچر) کہلاتا ہے" جیسا کہ ہم ابھی کہہ آئے ہیں معانی، الفاظ اور اصوات الفاظ کی ہم آہنگی ادبی کامیابی ہے حروف الفاظ اور اصوات الفاظ دونوں ملکر پڑھنے اور سننے والے کے ذہن کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر دونوں ایک دوسرے کا ساتھ نہ دیں تو عقل و سماعت پر بجائے متحد اثر ڈالنے کے دو جداگانہ اثر ڈالیں گے جو ادبی ناکامی کا سب سے بڑا ثبوت ہے برخلاف اس کے یہ دونوں اگر مساوی قوت عمل سے مدغم اور منضم ہو کر واحد اثر پیدا کریں تو زبان میں بلحاظ فصاحت ایک اسلوب خاص پیدا ہو جائے گا اور جس تحریر میں کوئی اسلوب خاص نہ ہو وہ تحریر ادبی نہیں ہو سکتی۔ اینٹس بھی کہتا ہے کہ ادبی تحریر اور عام علمی تحریر میں بہت بڑا فرق ہے۔ اس لئے کہ ادبی تحریر کسی مضمر خیال یا تحریک کو اسی طرح سے جامہ پہناتی ہے جس طرح جسم پوشیدہ روح کو ملبوس کر لیتا ہے"۔

ہمارے ملک میں ایسے نئے نئے تعلیم یافتہ سیکڑوں ہی ہوں گے۔ جنھوں نے کسی نہ کسی مقصد کی خاطر اردو انشا پردازی شروع کی ہے لیکن جیسا ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے۔ ان میں ایک دو بھی ایسے نظر نہیں آتے جنھوں نے اپنے اسلوب میں ایک خاص انفرادیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہو کوئی آزاد کا دلدادہ ہے۔ کوئی شبلی کا مقلد ہے کوئی حسن نظامی کا پیرو ہے، کوئی ابو الکلام کا معتقد ہے اور کوئی نیاز کا متبع اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بعض کامیاب مصنف ایسے

بھی گذرے ہیں جنھوں نے بڑے بڑے انشا پردازوں کی تقلید کرتے کرتے آخرکار اپنے نہج زبان اور اسلوب بیان کو خاص خاص سانچوں میں ڈھال لیا مثلاً خود خواجہ حسن نظامی جن کے اسلوب کی پیروی اس وقت دشوار ہوگئی ہے پہلے پہلے آزاد کی طرز میں لکھا کرتے تھے۔ اور بعضوں کا خیال ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں خطوط غالب کے اسلوب کی پیروی کرنا چاہتے تھے، لیکن آخرکار انھوں نے اپنے اسلوب بیان میں ایک عجیب انفرادیت پیدا کرلی جو آزاد اور غالب دونوں سے بالکل جدا ہے۔ تاہم اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ہر شخص اپنی انشا پردازی کی ابتدا کسی کی تقلید کے ساتھ شروع کرے اور اس طرح اپنی ذاتی اپج کو ملیامیٹ کر دے۔

جس طرح اصلیت ہر حقیقی ادب کا اساسی اصول ہے ہر طرز بیان کا بھی ہے وہ شخص جو در اصل کوئی ذاتی بات کہنی چاہتا ہے، اس کے ظاہر کرنے کے لیے کوئی ذاتی طریقہ بھی حاصل کر لیتا ہے۔ وہ خیال جو در حقیقت اس کا ذاتی خیال ہے کبھی گوارا نہ کرے گا کہ کسی دوسرے کے طریقہ بیان میں ظاہر ہو مرزا غالب جب اپنے خانگی خطوط لکھنے بیٹھتے ہیں جن میں ذاتی خیالات کی ترجمانی کرنی ہوتی ہے تو اپنی خاص طرز تحریر سے کام لیتے ہیں۔ برخلاف اس کے جب انھیں تقریظوں اور دیباچوں کے لکھنے کے لئے مجبور کیا جاتا ہے تو وہ پھر اسی طرز و روش پر چلنے لگتے ہیں جو اس زمانہ میں مقبول خاص و عام تھی۔

جب ہم کسی عبارت کو پڑھتے ہیں تو اس کے ساتھ ہی بول اٹھتے ہیں کہ

فلاں مصنف کی عبارت ہوگی۔ آزاد کی عبارت پڑھنے کے بعد ہم اس کو حالی کی عبارت ہرگز نہیں سمجھتے۔ کیا خواجہ حسن نظامی کی طرز تحریر ہمیں مجبور نہیں کرتی کہ ہم اس کو عبدالماجد فلسفی کی عبارت قرار دینے سے باز رہیں؟ نذیر احمد اور راشد الخیری کے اسالیب بیان عبدالحلیم شرر اور مرزا ہادی رسوا کی طرز تحریر سے بالکل جدا ہیں۔ کسی عبارت کے مطالب و معانی اپنے مصنف کی چغلی نہیں کھاتے بلکہ اس کا اسلوب بیان پکار اٹھتا ہے کہ میرا لکھنے والا فلاں شخص ہے۔ جس طرح کسی شخص کی آواز سنتے ہی ہم اس کو پہچان جاتے ہیں اسی طرح کسی طرز بیان کے مطالعہ ہی سے ہم اس کے مصنف کو معلوم کر لیتے ہیں۔ انتخاب الفاظ، ترتیب محاورات، فقروں کی بندش، عبارت کی روانی و برجستگی لکھنے والے کی شخصیت کے وفادار ترجمان ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ طرز بیان اصلی طور پر ایک ذاتی خصوصیت ہے۔

الگزنڈر پوپ نے اسلوب بیان کو "خیالات کا جامہ" قرار دیا ہے لیکن اس نے حقیقت حال کے اظہار میں غلطی کی کیونکہ اسلوب کو اس نے انسان کی ذات سے جدا کر دیا۔ اسلوب بیان جس طرح کارلائل نے کسی رسالہ میں لکھا تھا "انشا پردازوں کا لباس نہیں ہوتا بلکہ پوست"۔

ایک ایسا انگریز فاضل جو خود بھی بہترین اسلوب کا مالک تھا یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ ادب (لٹریچر) زبان کے ذاتی طریقہ استعمال یا مشق کو کہتے ہیں

یہ بالکل صحیح ہے۔ اس لئے کہ زبان میں ایک مصنف دوسرے مصنف سے بالکل جدا طریقہ پر کاربند ہوتا ہے۔ برخلاف اس کے عوام زبان کو بالکل اسی طرح استعمال کرتے ہیں جس طرح وہ اس کو حاصل کرتے ہیں۔ وہ ادیب ہی کیا جو اپنی زبان اور عوام کی زبان میں کوئی امتیازی یا انفرادی خصوصیت نہ پیدا کر سکتا ہو؟

سرسید، شبلی، نیاز یا حسن نظامی جیسی غیر معمولی استعداد تحریر رکھنے والی ہستی جب زبان استعمال کرتی ہے تو اس کی مطیع ہو کر نہیں استعمال کرتی بلکہ اس پر قابض ہو کر۔ وہ اس کو جس طرف چاہے موڑ لیتی ہے، اس میں جابجا اپنی شخصیت کی خصوصیات نمودار کرتی جاتی ہے۔ خیالات، معتقدات، احساسات اور توہمات کی موجیں جو اس کے محیط ذہنیت میں اٹکھیلیاں کرتی رہتی ہیں، تمیز، تقابل، تعلق اور تعمق کی جو قوتیں اس کی فطرت میں ودیعت ہیں، ظاہری اور معنوی اشیاء کے ساتھ اس کا برتاؤ، رسم و رواج اور تاریخ پر اس کا فیصلہ اس کی فراست، ذہانت، ذکاوت، ظرافت اور متانت کی جلوہ گری غرض ان تمام کے متعلق لاتعداد اور مسلسل تخلیق جو اس کی غیر معمولی صناعی کی مرہون منت ہوتی ہے۔ مخصوص اور انوکھی زبان کے ذریعہ ظاہر ہوتی ہے جو اس کے سایہ کی طرح ہمیشہ اسی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک خاص شخص کے سایہ کو کسی دوسرے شخص کا سایہ قرار دے سکتے ہیں تو ایک خاص مصنف کے اسلوب بیان

کو دوسرے مصنف کا اسلوب بھی ضرور سمجھ سکتے۔ یوہن وہ انگریز فاضل جن کا قول ہم نے ابھی اوپر نقل کیا ہے۔ بالکل ٹھیک کہتا ہے کہ "جس طرح کسی شخص کے تخیلات اور احساسات ذاتی ہوتے ہیں اس کی زبان بھی اسی کی ہوتی ہوگی غیر معمولی اور زبردست شخصیتوں کے ہاتھوں زبان پر ہمیشہ ایک نیا تازیانہ لگتا ہے ایک غیر معمولی ہستی میں جتنی زیادہ انفرادیت ہوگی اتنی ہی انفرادیت اس کی قوم کی اس زبان میں ہوگی جو وہ استعمال کرتا ہے۔ چنانچہ اس کے انفرادی اثر سے اس کے زمانہ کی زبان، قوم کی عام زبان سے بالکل مختلف ہو جاتی ہے اور یہ اختلاف بعض دفعہ اس قدر مہتم بالشان ہو جاتا ہے کہ ہم کسی اور کی معمولی اور روزمرہ کی زبان تو سمجھ لیتے ہیں لیکن اس زمانے کے بڑے بڑے مصنفین کی زبان سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اردو زبان پر ابوالکلام آزاد کا انفرادی اثر اس قدر عظیم الشان تھا کہ ان کی وجہ سے ایک زمانہ تک اردو انشاپردازوں کی زبان عام اردو زبان سے بالکل علیحدہ ہو گئی تھی اور یہی حال آج کل جناب نیاز فتحپوری کی شخصیت کا ہے کہ ان کی وجہ سے اردو زبان کو ایک بالکل نیا تازیانہ لگا ہے جو ان کی غیر معمولی انفرادیت کے باعث ان کی زبان کو عام اردو سے بالکل ممتاز بنا دیتا اور اور دوسروں کو اس سے متاثر کرنے کا ایک زبردست سبب ثابت ہوا ہے۔ ۲

"اسلوب بیان مصنف کی تمام زندگی کا عکس ہوتا ہے" اس میں کوئی

شک نہیں کہ پر عظمت زندگیوں کے حالات اکثر ان کی سیرت یا سوانح عمری سے معلوم کئے جاتے ہیں لیکن خود مصنف کا قلم اس کی تصنیفات میں جو اس کا کامل مرقع کھینچتا ہے، وہی حقیقی اور اصلی ہوتا ہے۔ دوسروں کے قلم صرف اس کے ظاہری خط و خال کا خاکہ کھینچ سکتے ہیں۔ لیکن قلب کی گہرائیوں میں جو رموز و اسرار مضمر ہیں ان کی تصویر کشی کے لئے جن رنگوں کی ضرورت ہوتی ہے، ان کا دوسروں کو میسر آنا دشوار ہے۔

"جب کسی کتاب کا آپ مطالعہ کریں تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ نہ صرف مصنف کی ذات غیر مضمر طور پر اس میں اپنی جھلکیں دکھاتی ہے بلکہ اس کے قلبی روحانی اور فنی ارتقار کا عکس بھی جا بجا اس میں نمودار رہتا ہے وہ آپ سے پکار پکار کر کہے گی کہ میرے خلاق کی تعلیمی حالت اس درجہ کی ہے اس کی فطرت کو بنانے اور معین کرنے میں ان ان اثرات نے کام کیا ہے، ان ان اساتذہ سخن کے آگے اس نے اپنا زانوئے ادب تہہ کیا تھا، جنھوں نے اس کو اس قابل بنا دیا کہ وہ اپنے کو قابل سمجھ سکے۔ ان ان کتابوں کی فضا میں اس نے اپنی زندگی بسر کی ہے۔ وہ لوگوں کے ساتھ اس طرح گفتگو کرتا رہا اس کے تخیلات میں اس طرح سنجیدگی اور پختگی آتی گئی، کائنات اور اس کے معموں پر اس نے ان ان طریقوں سے نظر ڈالی ہے۔ اس کی طبیعت میں اس طرح یہ خاص بات پیدا

ہو گئی اور اس کی صناعی کی تکمیل ان ان حالتوں سے ہو کر گذری ہے گویا تصنیف ایک آئینہ ہوتا ہے۔ جس میں مصنف مع اپنی قلبی گہرائیوں کے نظر آجاتا ہے۔ (وہی تصنیف زیادہ مقبول و محمود ہوتی ہے جس میں مصنف اپنے نفس کی چوریاں اور قلبی نفاستیں کھول کھول کر بیان کرتا ہے) یہی وجہ ہے کہ جب کبھی وہ کچھ بول اٹھتا ہے تو دوسروں کو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا ان ہی کے راز فاش کر رہا ہے ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا   میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

جس کسی میں جو بھی برائی یا بھلائی پائی جائے گی وہ اس کی ظاہری اور معنوی دونوں قسم کی اولاد میں ظاہر ہوئے بغیر نہ رہے گی حالی کا قومی جذبہ ان کی ہر علمی و ادبی تحریر سے نمودار رہتا ہے، مہدی حسن کی لطافت پرستی اور نفاست مزاجی ان کی ہر تحریر میں جلوہ گر رہتی ہے۔ مشہور انگریز شاعر ٹینی سن کے حب وطن کا جذبہ تنگ نظری کی شکل میں جابجا اس کی نظموں میں دکھائی دیتا ہے۔ اور شیکسپیر کی بلند اور وسیع نظری غیر قوموں کا بھی جہاں ذکر کرتی ہی فیاضی سے کام لیتی ہے۔ غالب کی خودداری اور سرسید کا خلوص ان کی تصنیفات میں چھپائے نہیں چھپتا اور میر تقی میر کی قنوطیت ان کے تقریباً ہر شعر سے مترشح ہوتی ہے۔

۱ کمرے کے روشندان میں اگر متفرق رنگ کے شیشے لگائے جائیں تو

(اگرچہ آفتاب کی شعاعیں ان سب پر یکساں پڑتی ہیں) ہر شیشہ اپنا الگ الگ رنگ کمرے میں منعکس کر دیگا۔ اسی طرح ایک ہی مضمون پر متفرق مضمون نگار اپنی ذات اور خاص ذہنیت کے اثر سے مختلف روشنی ڈالتے ہیں مشہور افسانہ نگار اڈگر الن پو کا مقولہ ہے روح کے پردے میں ہمارے احساسات کو جو کچھ محسوس ہوتا ہے اس کی تشریح کو فن لطیف کہتے ہیں“

اسلوب بیان کے ذریعے سے نہ صرف مصنف کی شخصیت کا اظہار ہوتا ہے بلکہ اس کے ماحول کے متعلق بھی معلومات ہوتے ہیں۔ جس طرح کوئی تحریر اپنے مصنف کی چغلی کھاتی ہے اپنے زمان و مکان کے متعلق بھی گواہی دینے لگتی ہے۔ شہنشاہ اکبر کے زمانہ کی تصنیفات کی خصوصیت اورنگ زیب کے عہد کی مصنفات کی خصوصیات سے بالکل علیحدہ ہوں گی میر و سودا کا ماحول امیر و داغ کے ماحول سے کوئی میل نہیں کھاتا داغ کے زمانے کے کسی شاعر کا کلام فوراً ظاہر کر دیگا کہ میرا مصنف داغ کا ہمعصر تھا نہ کہ میر تقی اور مرزا رفیع کا سرسید کے زمانہ کی لکھی ہوئی تحریروں اور نیاز کے ماحول میں لکھی ہوئی عبارتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

✓ انشا پرداز کی انفرادیت اور ماحول کی کیفیات کو اسلوب بیان میں جو اہمیت حاصل ہے اس کو مدنظر رکھنے کے بعد ہمارے انشا پردازوں کو

اسلوب بیان کی خوبیوں اور ان کی نوعیت کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے

یہ ظاہر ہے کہ نثر بہ نسبت نظم کے اظہار خیالات کا زیادہ آسان اور سہل الحصول ذریعہ ہے کیونکہ وہ نظم کے برخلاف بحر اور قافیہ کی قیود سے آزاد ہے۔ اس کے علاوہ موضوع کے لحاظ سے بھی نثر کو نظم کی بہ نسبت زیادہ مضامین پر دسترس حاصل ہے۔ شاعری صرف اس وقت کی جاتی ہے جب کسی ادبی صداقت کی ترجمانی کرنی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے نثر میں ہر دلچسپ یا کارآمد موضوع پر عبارت آرائی کی جا سکتی ہے اور جس طرح شاعری کے محاسن دریافت کرنے کے لئے بعض اصول مقرر کیے گئے ہیں نثر کے متعلق بھی قایم کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہر بہترین نثر کی ایک علامت یہ ہے کہ اس کو پڑھتے وقت آواز میں مد و جزر اور دلآویزی پیدا ہو جس کے بغیر فطرت اور ادبیات دونوں کی فضا کئی خوبیوں سے محروم ہو جاتی ہے۔

یہ مد و جزر اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب کہ مصنف کے احساسات و جذبات میں بھی اس کے لکھتے وقت تلاطم پیدا ہو رہا ہے اور پھر یہ ایک ضروری امر ہے کہ یہ تلاطم جس قسم کا ہوگا تحریر میں اسی قسم کا مد و جزر پیدا ہو جائیگا۔ مثلاً جب فلسفیانہ خیالات کا تلاطم دماغ میں پیدا ہو جاتا ہے تو دماغی جولانگاہ میں استدلال اور اصطلاحی لفظوں کی فوجوں کے

۱۱۴ بالکل صحیح [illegible] نثری فقرہ [illegible] زبانوں پر صادق آتی ہے

پرے کے پرے اترنے لگتے ہیں یا کسی خطرناک حادثہ اور جنگ کے بیان
کے وقت لکھنے والے کے دماغ میں پرجوش تہلکہ انداز اور ہیجان انگیز الفاظ
طغیانی پیدا کر دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں جو عبارت لکھی جاتی ہے وہ نہایت
شاندار اور پرتاثیر ہوتی ہے پس اپنی تحریروں میں اثر اور دوامیت پیدا
کرنے کے لئے کسی انشا پرداز کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ جس کیفیت کو ظاہر
کرنا چاہتا ہے اس قسم کی کیفیت پہلے خود پر طاری کرلے ورنہ اس کی تحریر
میں ایک مناسب وجزر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ یہی وہ مدوجزر ہے
جس کے باعث آزاد، خواجہ حسن نظامی اور سلیم کی تحریریں پڑھنے اور
سننے والوں کے قلب و دماغ میں ایک خاص کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس امر کی طرف اردو انشا پردازوں کو خاص طور پر توجہ کرنے
کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر اردو کا مستقبل شاندار نہیں ہو سکتا لیکن
اس میں سخت احتیاط کی بھی ضرورت ہے کیونکہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا
ہے کہ مصنف جوش و جذبہ میں آکر کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔ اور اپنے
ماحول کی رنگ رلیوں میں اس قدر محو ہو جاتا ہے کہ رندانہ نعرے لگانا
شروع کر دیتا ہے جو اکثر اوقات ادبی شان کو ملیامیٹ کرنے میں بڑا
کام کر جاتے ہیں۔

اسلوب بیان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ عبارت میں ہر جملہ کا

[illegible]

مطلب اس قدر صاف ہو کہ اس کے سمجھنے کے لئے کسی قسم کے شک و شبہ کی گنجائش نہ رہے۔ اور نہ صرف ہر جملہ کا بلکہ اجتماعی طور پر ہر اک عبارت کا مطلب بھی معین ہونا چاہیئے اس لئے کہ متعدد عبارتیں ملکر ایک پورا مضمون اور اسلوب بنتا ہے۔ آر، ال اسٹیونسن نے اس کے متعلق حسب ذیل رائے دی ہے۔

> ہر جملہ میں بجز اس کے کہ وہ بہت ہی مختصر ہو ایک قسم کا عقدہ یا گرہ ہوتی ہے ایک حد خاص تک بتدریج تعقید یا ایک طرح اجمال بڑھتا جاتا ہے اور اس کے بعد حل یعنی تفصیل کا درجہ ہے۔ فن کلام کا اقتضا یہ ہے کہ اس طرح اجمال و تفصیل یا حل و عقد خیالات کے مقابلہ میں جملہ میں بھی اس قسم کا حل و عقد یا اجمال پایا جائے۔ جب تک خیالات کے عقدے کے مقابل میں الفاظ میں بھی تعقید نہ ہوگی کلام کے دو جداگانہ اثر جو عقل و سماعت پر ہونے چاہیئے تھے بجائے مجموعی واحد اثر پیدا کرنے کے ایک دوسرے کے مخالف اثر پیدا کریں گے۔ لہذا کلام کے تار و پود میں معانی و اصوات الفاظ کا ایک انداز خاص میں ہونا ضروری ہے۔ کلام کا وہ اثر جو سامع سے تعلق رکھتا ہے، فصاحت کی بنیاد ہے اور خوبی کلام بہ نسبت کسی اور چیز کے زیادہ تر اسی پر موقوف ہے اس بات میں مصنف کو نظم کی نسبت نثر میں زیادہ سہولت و آزادی رہتی ہے۔ نظم کا نمونہ مشکل ہوتا ہے۔ نثر میں ایک انداز خاص سامع کے مطابق بنا دینا چنداں مشکل نہیں اس کے بعد صرف اتنا کام باقی رہ جاتا ہے کہ

مصنف پر لطف تنوع سے کام لے کر تکرار و اعادہ الفاظ سے حتی الامکان گریز کریں۔" (منقول از مقدمہ خیابستان)

ایک یونانی نقاد ڈایونی سئس کا یہ خیال کس قدر صداقت پر مبنی ہے کہ ترتیب الفاظ بہ نسبت انتخاب الفاظ کے زیادہ قابل توجہ ہے" چنانچہ کسی اچھی عبارت کی ترتیب کو ہم بدل دیں تو اس کے سارے محاسن ملیا میٹ ہو جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ عبارت کا وہ اثر جو الفاظ کی خاص ترتیب سے پیدا ہو سکتا تھا باقی نہیں رہ سکتا۔ یہ امر آج کل کے ان نوجوان انشا پردازوں کے لیے خاص طور پر قابل توجہ ہے جو ٹیگور کی نظموں کے دو ترجموں کی تقلید میں نفیس اور پاکیزہ الفاظ ایک جگہ جمع کر لیتے ہیں۔ بغیر ترتیب و تنظیم الفاظ کی خوبیوں پر نظر رکھتے ہوئے سے نئے اور اچھے سے اچھے الفاظ اور ترکیبیں اختیار کرنے سے انشا پردازی میں کمال حاصل نہیں ہو سکتا۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ الفاظ کوئی چیز نہیں ہیں الفاظ کی حقیقت کے متعلق شبلی فرماتے ہیں۔

> الفاظ درحقیقت ایک قسم کی آواز ہے اور چونکہ آوازیں بعض شیریں، دلآویز اور لطیف ہوتی ہیں مثلاً طوطے و بلبل کی آواز اور بعض مکروہ و ناگوار مثلاً کوے اور گدھے کی آواز اس بنا پر الفاظ بھی دو قسم کے ہوتے ہیں بعض شستہ بہت شیریں اور بعض ثقیل بھدے ناگوار پہلی قسم کے الفاظ کو

فصیح کہتے ہیں اور دوسرے کو غیر فصیح ۔ اور بعض الفاظ ایسے ہوتے ہیں کہ فی نفسہٖ ثقیل اور مکروہ نہیں ہوتے لیکن تحریر و تقریر میں ان کا استعمال نہیں ہوتا ہے ۔ یا بہت کم ہوا ہے ۔ اس قسم کے الفاظ بھی جب ابتداءً استعمال کئے جاتے ہیں تو کانوں کو ناگوار معلوم ہوتے ہیں، ان کو فن بلاغت کی اصطلاح میں غریب کہتے ہیں، اور اس قسم کے الفاظ بھی فصاحت میں خلل انداز کئے جاتے ہیں (منقول از موازنہ انیس و دبیر)

اسی قسم کے اصول کو ملحوظ رکھکر انگلستان کا مشہور نقاد رسکن یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ خوبصورت اور کامل الفاظ یاد رکھنا بہت ہی قابل قدر اور بہترین عقلمندی ہے بہ نسبت اس کے کہ ایسے مبتذل الفاظ ایجاد یا اختیار کئے جائیں جو زبان کو خراب کر دینے والے ہوں۔"

اڈورڈ ٹامس نے الفاظ کے متعلق کیا ٹھیک کہا ہے کہ "الفاظ گو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔ لیکن زمین اور آسمان دونوں کی ان تمام اشیاء کو قابو میں رکھ سکتے ہیں جو بہت ہی وزنی مضبوط اور طاقتور ہوتی ہیں جو نہایت ہی حسین ہوتی ہیں اور جو یا تو بہت جلد فنا ہو جاتی ہیں اور یا ہمیشہ باقی رہنے والی ہوتی ہیں"۔

غرض یہ معمولی معمولی الفاظ ہی تو ہیں جن کی مدد سے دنیا آج ہمیں معراج ترقی پر پہنچی نظر آتی ہے ۔ مارون نے اپنی پراز معلومات کتاب

"ڈی لیونگ پاسٹ" میں ارتقائے تمدن کے دیگر اسباب میں اسی سبب کو زیادہ رفیع الشان قرار دیا ہے تاہم اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ الفاظ بغیر خوبی ترتیب کے محض بیکار رہیں ڈایونی سئس کا مشہور قول ہے کہ الفاظ ہی کی مناسب ترتیب سے ادب مع اپنے متفرق شعبوں کے پیدا ہوتا ہے"

پس انشا پردازی کا اصلی گر اس میں ہے کہ لفظوں کو اس ترتیب کے سے استعمال کیا جائے کہ اس میں ایک مخصوص مد و جزر پیدا ہو سکے کیونکہ جس تحریر میں مد و جزر نہ ہو اس میں کوئی خاص اسلوب نہیں ہوتا ۔

اعلیٰ اسلوب کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ پڑھنے والے کو ایک خاص اور وجدانی فضا میں منتقل کر دیتا ہے، اس فضا میں فطرت اخلاق اور روحانیت کی حقیقتیں جس قدر زیادہ ہوں گی اتنا ہی اس اسلوب کا مرتبہ بلند ہو گا ۔ آزاد ۔ غالب ۔ اور حسن نظامی کی نثر کا شبلی سرسید، محسن الملک اور عبدالماجد کی نثر کے ساتھ مقابلہ کرنے سے ہمیں اس خاص خاص ماحول کا اندازہ لگ سکتا ہے جس کو ایک انشا پرداز اپنی تحریر کے ذریعہ سے پیدا کر دیتا ہے ۔ ان میں سے ہر ایک کا اسلوب بالکل جدا اور آزادانہ ہے، یہ خیال کرنا کہ ایک کا اسلوب دوسرے کی طرز تحریر سے میل کھاتا ہے ۔ بالکل غلط ہے، کیونکہ ہر ایک کی دماغی

ساخت بالکل جدا ہوتی ہے۔ کسی نے بہت ٹھیک کہا ہے کہ "کسی کو بھی حق حاصل نہیں کہ متفرق اساتذہ کے متفرق اسالیب پر فیصلے صادر کرے کہ یہ اچھا ہے اور یہ برا" اگر ہر مصنف کے پیدا کردہ خاص ماحول کی صداقتوں کی زیادتی یا کمی، معیار حسن و قبح نہ قرار دی جاتی تو ہم ایک اسلوب کو کبھی دوسرے اسلوب پر ترجیح نہ دے سکتے۔ اب یہ آسانی ہے کہ مصنف کی پیدا کردہ خاص ذہنی اور وجدانی فضا کے مطالعہ کے بعد ہم جس میں حقایق کا فقدان پاتے ہیں اس کو کم رتبہ قرار دیتے ہیں اور جس میں ان کی فراوانی ہوتی ہے۔ اس کو شاندار و پر عظمت، یہی وجہ ہے کہ جب ہم اس قسم کا اسلوب دیکھتے ہیں جس میں فارسی کی تقلید کی وجہ سے مبالغوں اور تکلف سے کام لیا جاتا ہے تو اس کو خراب قرار دیتے ہیں بے جا مبالغے بے موقع جوش و خروش اور بے کار الفاظ کی کثرت جس سے ہمارے اکثر انشا پردازوں کی تحریریں موفور ہوتی ہیں، ہمیشہ اسلوب بیان کی ترقی کے سد راہ ہے۔

ایک کامیاب انشا پرداز بننے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ زبان موضوع کی فطرت کے موافق اختیار کی جائے۔ یہ یقین کر لینا کہ عجیب و غریب زبان اور انوکھا اسلوب بیان اختیار کرنا باعث ترقی و شہرت ہے یا روزمرہ کی بول چال اور جاہلوں کی زبان میں ادبی کتابیں تصنیف کرنا مقبولیت

کا ذریعہ ہے سخت غلطی ہے، ہر موضوع اور ہر بحث کے لئے ایک خاص طرز بیان کی ضرورت ہے۔ آج کل دیکھا جاتا ہے کہ لوگ اردو کو آسان تر اور زیادہ آسان بنانے کے لئے صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دوسری زبانوں کے لفظوں کو کوڑا کرکٹ کی طرح اردو سے علیحدہ کرکے صرف دلی کے بازاری محاورات اور عورتوں کے الفاظ کو اردو کا سرمایہ قرار دیں۔ لیکن یہ بھی غلطی ہے۔ اس لئے کہ کسی زبان کو معراج کمال حاصل کرنے کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری ہیں بقول مولانا آزاد "اول یہ کہ اس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں دوم یہ کہ اس کی انشا پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو"۔ اور جب اردو سے غیر زبانوں کے الفاظ نکال دئے جائیں گے اور اس کو صرف خاص خاص شہروں اور بازاروں کے محاوروں اور بول چال پر منحصر کر دیا جائیگا تو یہ دونوں باتیں کس طرح حاصل کی جا سکتی ہیں۔ کیا دلی کی زبان میں ہم مذہبی فلسفیانہ، تاریخی، معاشی، طبیعیات اور دیگر فنون سے متعلقہ مضامین ادا کر سکتے ہیں۔

اری گل چمن او زینب! اے ہے نگوڑی یہ کہاں غارت ہوگئیں

'اچھی بوا جان! خدا کے لئے جلدی یہاں آنا دیکھو تو بڑی دلہن کو

کیا ہوگیا ہے ۔ آئے بی خالہ منتو آئے ۔ بی خالہ منتو' اے ہے کوئی نہیں آتا ۔ دولی کیا ہوگیا ہے! منجھو' تم تو کفن پھاڑ کر چیختی ہو ۔ دولی آخر ہے کیا؟ اچھی جلدی یہاں آؤ ۔ دولی میں کیا کروں؟ میرے اللہ! چلانے والی بی بی تیس بتیس برس کی پہنا ہوا سفید آڑا پائجامہ نیچا نیچا تنیں آب رواں کا کرتہ پتے دوپٹہ جو کچھ کندھے پر پڑا کچھ فرش پر جھاڑو دے رہا ہے ۔ پیازی رنگ کا تھا ۔ بے چاری باؤلی بنی چیخ رہی تھی ۔ دو تین چھوکریاں خیلا جان بیلا اے ہے لے ہے کرتی سہ دری کی طرف دوڑیں ۔ ایک ادھیڑ سی بیوی جو خالہ منتو تھیں ماتھے پر عینک رکھے ایک پاؤں میں جوتی دوسری ندارد سر کھلا لپک کے سیسے نکل بھد بھد کرتی حواس باختہ سہ دری میں در آئیں آنکھ پھاڑ کر دیکھا منجھلی دلہن کا دھڑ تو سوزنی پر ہے اور ٹانگیں چاندنی پر ۔

(علی گڑھ میگزین)

ایک دوسری مثال ملاحظہ ہو ۔

دولی سید کے مدرسہ کے لڑکے تو نگوڑے خاصے مداری ہو جاتے ہیں کہ پیچھے ہاتھ لے گئے اور مداری کی ٹوکری کی طرح کبھی ہاتھ ڈال جھٹ رومال نکالا، کبھی سرمہ کی قلم، کبھی چائے پانی کی دعوت سے اڑایا ہوا رنگترہ، غرض دنیا بھر کی چیزیں ہیں کہ نکلی چلی آتی ہیں۔

نگوڑی جیبیں کیا ہوئیں عمر و عیار کی زنبیل ہو گئی"۔ علی گڈھ میگزین)

بہت ممکن ہے کہ آغا حیدر حسن (علیگ) جو ان عبارتوں کے مصنف ہیں اس اسلوب میں ہر موضوع کو ادا کر سکتے ہوں لیکن کوئی خاص اسلوب متعین کر دینا اور ہر شخص سے اس کی پابندی کی امید کرنا لغو ہے جس طرح جتنے منھ اتنی ہی باتیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح جتنے قلم ہوتے ہیں اتنے ہی اسالیب ہوتے ہیں یوں تو ہر مصنف کا قلم اپنی خاص اہمیت ہمیشہ نمایاں رکھتا ہے۔ لیکن دیکھنا یہ چاہیئے کہ فطری جذبات سچائی کے ساتھ اور خوش سلیقگی سے ظاہر کئے گئے ہیں یا نہیں اور مصنف نے لفظی ٹیپ ٹاپ کو بجائے خود مدعا تو نہیں بنا لیا ہے۔

اسی سلسلہ میں ایک ایسے امر کا تذکرہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جس پر ہم نے اس سے قبل بھی زور دیا ہے اور جس کے بغیر ہمیں یقین ہے کہ اردو زبان کبھی پختہ اور ہمہ گیر نہیں ہو سکتی۔ یہ ضروری امر اردو کے فطری رجحانات کا بہاؤ ہے اردو جن عناصر پر مشتمل ہے ان میں سب سے بڑا اور اہم عنصر یہ ہے کہ متفرق زبانوں اور بولیوں کے الفاظ بے دھڑک استعمال کئے جائیں۔ یہی وہ چیز ہے جس پر اردو کا سنگ بنیاد رکھا گیا اور افسوس ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس عرصہ میں اردو کو اپنے فطری میلان سے محروم کر دینے کے لئے سخت سے سخت کوششیں

کی گئی ہیں ۔ دہلی اور خاص کر لکھنو کے اکثر ارباب علم و فضل نے اس بارے میں نہایت شدت پسندی سے کام لیا ہے ۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان کے حسن و قبح کے متعلق کوئی نہ کوئی معیار ہونا ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی خاص شہر یا محلہ کی زبان کو تمام ملک کے لئے معیار قرار دیدیا جائے ۔ یہ اردو زبان کی بدقسمتی ہے کہ آج تک اس میں معیار حسن و قبح کا انحصار خاص خاص محلوں اور شہروں کی بولیوں پر رکھا جاتا ہے ۔ اور ہمارا خیال ہے کہ اردو نے اب تک علم و فضل اور فنون وغیرہ میں جو کما حقہٗ ترقی نہیں حاصل کی اس کی اصلی وجہ یہی ہے کہ اردو داں اب تک الفاظ اور محاوروں وغیرہ کے جھگڑوں میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ خیالات کی طرف توجہ کرنے کا انہیں بدقسمتی سے موقع ہی نہیں ملا ۔ جہاں ان کی نظر کسی تحریر پر پڑتی ہے وہ یہ دیکھنے لگتے ہیں کہ اس میں کتنے الفاظ محاورہ اور روزمرہ کے خلاف لکھے گئے ہیں ۔ ان کی نگاہیں کبھی اس چیز کی تلاش نہیں کرتیں کہ اس تحریر میں دہلی یا لکھنو کے کتنے خیالات عمدہ اور جدید طرز میں پیش کئے گئے ہیں ۔

ہمیں تعجب تو اس وقت ہوتا ہے کہ آج کل بھی بعض تعلیم یافتہ افراد جنھیں خوش بختی سے اردو زبان کی جدید مطبوعات پر تنقید و تبصرہ کرنے کا موقعہ نصیب ہوا ہے جب کبھی تنقید

کرنے کے لئے قلم اٹھاتے ہیں تو سب سے پہلے جس امر کو قلم بند کر لیتے ہیں وہ یہی ہے کہ مصنف نے محاورہ یا روزمرہ کی یہ یہ غلطیاں کی ہیں۔ مصنف کے خیالات اور وہ امور جن پر کتاب کا موضوع مشتمل ہے کبھی ان اندھے تنقید نگاروں کی توجہ اپنی طرف منعطف نہیں کر سکتے۔

صرف یہی نہیں یہ نقاد صفحے کے صفحے اس بحث میں سیاہ کر دیتے ہیں کہ مصنف نے یہ محاورہ غلط لکھا اور اس لفظ کو دہلی یا لکھنو کے روزمرہ کے مطابق استعمال نہیں کیا۔ جہاں کسی نے علمی ضرورت کے مطابق کوئی نیا لفظ یا نئی ترکیب استعمال کی ان کے سینہ پر سانپ لوٹ گیا۔ وہ (اگر خوش قسمتی یا بدقسمتی سے دہلی یا لکھنو یا ان کے قرب قرب وجوار کے باشندے ہوں) ہمیشہ اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ زبان ہمیں وراثت میں ملی ہے کسی دوسرے شہر کے رہنے والے کو کوئی حق حاصل نہیں کہ زبان دانی کا دعویٰ کرے "دریائے لطافت" جو اس قسم کے مضحکہ خیز خیالات کا ایک خاصہ قیمتی ذخیرہ ہے اردو زبان کی اس بدقسمتی کا ایک زبردست مظہر ہے۔

انشاء اللہ خان تو خیر اس دور کے انسان تھے جو اردو زبان کا عہد جاہلیہ کہلایا جا سکتا ہے۔ احیاء علوم کے موجودہ زمانہ میں بھی ہمیں بعض ہستیاں ایسی نظر آتی ہیں جو اس قسم کے خیالات کی علمبرداری

کرتے ہوئے اپنے تئیں اردو کا محسن شمار کرانا چاہتی ہیں لیکن ہم جرات کے ساتھ اس امر کا اظہار کر دینا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے لوگ اردو کے حقیقی خدمت گذار ہونا تو کجا یقینی بدخواہ ہیں۔ ان لوگوں کو دنیائے اردو میں زندہ رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں جو ایک دقیانوسی خیال پر اڑے ہوئے ہیں اور ان کے سد راہ ہوتے ہیں جو اردو کو ایک ہمہ گیر زبان بنانے کی سخت جد و جہد کر سکتے ہیں۔

کیا کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کر سکتا ہے کہ کوئی زبان اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک کہ اس میں متفرق بولیوں کے الفاظ، محاورے اور ضرب المثلیں آئے دن شامل نہ ہوتی ہیں؟

ہر بولی اور ہر صوبہ کی مقامی زبان میں کچھ نہ کچھ خوبی ضرور ہوتی ہے مثال کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دکن یا پنجاب کے بعض محاورے تشبیہیں اور ضرب المثلیں ایسی ہیں کہ اگر ان کو رائج کیا جائے تو وہ یقیناً اردو زبان اور ادب کی توسیع کے باعث ہوں گی یہ عمل صرف اردو ہی کے ساتھ مخصوص نہیں دنیا کی تمام ترقی یافتہ زبانوں میں یہ رجحان ضرور پایا جاتا ہے۔ ان کی متفرق بولیاں ان کے لئے معاون کا کام دیتی ہیں۔ جب تک کسی دریا کو اس کی معاون ندیاں پانی نہ پہنچایا کریں گی ظاہر ہے کہ وہ باقی نہ رہے گا یا تو وہ بہت جلد خشک

ہو جائیگا یا جب تک تازہ اور نیا پانی اس میں آئے دن داخل نہ ہوتا رہیگا اس کا پانی گدلا رہے گا ۔ موجودہ زمانہ میں اردو کی یہی حالت ہے بدقسمتی سے دہلی اور خصوصاً لکھنؤ کے ادیبوں اور شاعروں کی کوششوں سے اس میں جو ٹھیراؤ پیدا کر دیا تھا وہ اب تک قایم ہے اردو خاص خاص حدود میں محصور کر دی گئی ہے جو محاورہ دہلی یا لکھنؤ کی ٹکسال میں کھرا نہیں اترتا غلط قرار دیا جاتا ہے ۔ حالانکہ یہ زبان پر ایک سخت ظلم ہے ۔ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنا اور نہ صرف یہی اس قسم کے خیالات کا ردعمل کرنا اردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہے ہمیں امید ہے کہ ہماری زبان کے نوجوان انشاپرداز اردو کے اس فطری رجحان کا ضرور لحاظ رکھیں گے اور اپنے اپنے وطن کی بولیوں کے مخصوص الفاظ محاورے روزمرے استعارے تلمیحیں تشبیہیں وغیرہ نہایت آزادی کے ساتھ استعمال کرنے لگیں گے ۔ یہ ظاہر ہے کہ ان میں سے جو چیزیں جاندار ہوں گی وہ زندہ رہیں گی اور جن میں چلنے پھرنے کی سکت نہ ہوگی خود بخود وہ نیست و نابود ہو جائینگی ۔ لیکن جو چیزیں چل پڑیں گی ان کے باعث یقین ہے کہ اردو بہت جلد زبان اور ادب دونوں کے لحاظ سے ترقی کریگی ۔ اور اس کے اسالیب میں گونا گونی پیدا ہو جائے گی ۔ اس طریقہ کار سے جہاں ایک ہی خیال

کو ادا کرنے کے متفرق پیرائے اردو میں موجود ہو جائیں گے۔ الفاظ کا
بھی کافی ذخیرہ مل جائے گا اور یہ مسلم الثبوت ہے کہ زبان میں جس قدر
زیادہ الفاظ ہوں گے اتنی ہی وہ زبان پختہ طاقت ور اور ہمہ گیر ہوگی

ہماری زبان میں خیالات کو ادا کرنے کے سانچے بالکل محدود
ہیں ان میں وسعت دینا ہمارا فرض ہے اور یہ اسی وقت انجام پا سکتا
ہے جب ہم اپنے وطنوں اور شہروں کے خاص خاص لفظوں
محاوروں اور ترکیبوں کو دل کھول کر استعمال کریں۔ اس کی وجہ سے
ہماری زبان کا جو خاص نہج ہے وہ بھی ترقی پائیگا کسی تحقیقی انشا پرداز
کا فرض یہ نہیں ہے کہ وہ ریاضی کے مسئلوں کی طرح بیان کرنے کے
مقررہ پیرایوں ہی کو وفاداری اور صحت کے ساتھ استعمال کرے
بلکہ یہ امر اس کے لئے باعث ننگ و عار ہے۔ اس کا فرض یہ ہے
کہ وہ نئے اور لطیف طریقے اپنے خیالات کے اظہار کے لئے پیدا کرے
اور بعد میں انہیں نہایت آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ استعمال کرے

تو بہترین نہج زبان وہی ہے جس میں حسن بیان نہ صرف قائم رہے
بلکہ ترقی کرے اس ترقی میں رنگا رنگی اور تنوع کو شامل سمجھا جائے
اور ساتھ ہی حسن خیال کو حسن بیان کی جان قرار دیا جائے اور جب
کبھی کوئی مرصع اور پر تکلف تحریر ہم لکھنی چاہیں تو یہ بات ملحوظ

رکھیں کہ الفاظ نہ صرف حامل خیالات ہوں بلکہ ہمارے خیالات دور تک کے لئے ایسے تخم بن جائیں جن میں آئندہ بار آور درخت بننے کی استعداد ہو۔ اور وہی اسلوب بہترین خیال کیا جا سکتا ہے جس میں گوناگونیوں اور رنگینیوں کی کثرت پڑھنے والے کو مسرت اور حیرت کے سمندر میں ڈال دے۔ اگر کوئی جملہ طویل ہو تو کوئی بالکل چھوٹا کسی میں استعارہ ہو تو کسی میں تشبیہ کبھی فصاحت جھلکیاں دکھا رہی ہو تو کہیں فطریت رونما ہو غرض تحریر ایک طوفان خیز سمندر ہو جس کی مضطرب موجوں پر مدوجزر کی پوری کیفیت طاری ہو اور جس کی سطح کچھ اس قدر عجیب و غریب اشیاء کا گہوارہ بنی ہوئی ہو کہ ان کی دلچسپیاں پابستگان ساحل کو نہ صرف متوجہ کر لیں بلکہ اس بات پر بھی مجبور کر دیں کہ وہ سمندر کی گہرائیوں میں کود پڑیں اور گراں بہا موتی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

ادبی تصنیف بھی ایک جاندار کے مانند ہوتی ہے جس میں سر پیر ہاتھ ناک کان وغیرہ سب اپنی اپنی جگہ موجود ہوں۔ اگر کان ہاتھ سے بھی بڑھ جائیں اور آنکھیں پیٹ پر ہوں تو حسن باقی نہ رہے گا۔ مصنف کو ہمیشہ اس امر کا لحاظ رکھنا پڑتا ہے کہ جس طرح معنوی حسن کی نگہداشت لازمی ہے ظاہری تناسب کی بزرگداشت

بھی ضروری ہے ورنہ اس کی تصنیف ایک مجذوب کی بڑ ہوگی جس میں کوئی ترتیب اور تناسب نہیں ہوتا ۔ جن پہلوؤں پر زیادہ زور دینا ضروری ہے ان پر زیادہ روشنی ڈالنی چاہیئے اور جن پہلوؤں کو پیش کرنا مقصود نہ ہو ان پر سے اس طرح سے گذر جانا چاہیئے کہ مطالعہ کرنے والوں کو یہ معلوم بھی نہ ہو کہ یہاں مصنف دامن بچائے ہوئے نکل رہا ہے ۔ کسی بات کی بے جا تفصیل بھی پڑھنے والوں کو برداشتہ خاطر کر دیتی ہے ۔ تفصیل پیش کرنا ایک مصور یا نقاش یا مورخ کا کام ہے ۔ تخلیقی انشا پرداز کو چاہیئے کہ صرف اشارے اور ذہنی مرقعے پیش کر دے ۔ اس کے الفاظ میں اس قدر قوت ہونی چاہیئے کہ وہ ذرا سے اشارے میں صفحۂ دماغ پر سیکڑوں مرقعے اور تصویریں پیش کر دیں الخ

ایک زبردست ادیب اور بہترین اسلوب بیان کا مالک وہ انشا پرداز ہوتا ہے ۔ جو سب سے پہلے ایک تخم پیش کر دیتا ہے اس کے بعد اس میں سے درخت پیدا کرنا شروع کرتا ہے اور بتدریج خوشرنگ پھول اور خوش ذائقہ پھلوں سے مطالعہ کرنے والوں کو تکیف اور لذت اندوز ہونے کا موقع دیتا ہے ۔

اردو شہ پارے

مصنفہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری پروفیسر جامعہ عثمانیہ

پر ہندستانی اکیڈیمی (الہ آباد) کا تبصرہ مطبوعہ جولائی ۱۹۳۱ء

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ملک کے ایک ذہین اور ہونہار نوجوان ہیں اور اپنے اندر فضل و کمال کے ساتھ، جوش عمل اور ولولۂ کار بھی رکھتے ہیں ۔ اب سے قبل ان کی "روح تنقید" اور "اردو اسالیب بیان" وغیرہ کتابیں ملک میں شایع ہو کر کافی شہرت حاصل کر چکی ہیں ۔

زمانۂ قیام یورپ میں بھی ان کے ذوق عمل نے ان کو بیکار نہیں رہنے دیا ۔ چنانچہ ادبیات اردو کے اس نایاب ذخیرے کی مدد سے جو لندن، نیز یونیورسٹی اور انڈیا آفس کے کتب خانوں میں ہیں، آپ نے "اردو شہ پارے" کے نام سے ایک کتاب تین جلدوں میں لکھنے کا قصد فرمایا، زیر تبصرہ کتاب انہیں کی پہلی جلد ہے جو مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد سے شایع ہوئی ہے ....

....اس جلد میں لایق مرتب نے صرف شاہکاروں اور شہ پاروں کے جمع کر دینے پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ ان مصنفین کے تذکروں اور ان کے عہد و احوال کے ذکر پر (۱۷۰) صفحات کا ایک مبسوط مقدمہ بھی لکھا ہے ظاہر ہے کہ ولایت کے کتب خانوں سے مصنفین و شعراء کے کارناموں کو

اپنے ذوق کے مطابق انتخاب کرکے شایع کردینا کوئی بہت بڑا کام نہ تھا۔ ان کے حالات کا جمع و تلاش کرنا پھر مختلف حالات و روایات کو غور و تحقیق کے ساتھ رد و قبول کرنا بڑی محنت و لیاقت کا کام تھا ۔ ....

فاضل مرتب چونکہ مشرقی طرز تصنیف کے ساتھ ساتھ مغربی طریقۂ تصنیف سے بھی باخبر ہیں اس لئے انھوں نے اس میں متعدد امور کے اضافہ سے اپنی تصنیف کو مفید، سہل المطالعہ اور زمانۂ حال کی تصانیف کے موافق بنا دیا ہے ۔ مثلاً مقدمہ کے ہر باب کے شروع میں فہرست مضامین اور فہرست شعراء دیدی ہے اور ہر باب بلکہ ہر دور میں ایک ایک تمہید ہے جو اس باب یا دور کے حالات پر مجموعی رائے ہے ۔ فہرست شعراء و مصنفین کے ساتھ اور تاریخیں بھی درج ہیں ۔ پھر اصل کتاب یعنی انتخاب کلام سے قبل دو فہرستیں ہیں ایک بلحاظ مضامین دوسری بلحاظ مصنفین ۔

دوسری فہرست میں پھر یہی شعرا اور مختلف نسخوں کے ماخذ کا ذکر کردیا ہے مگر ان سب سے زیادہ مفید آخر کے ضمیمے ہیں جن میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہر مصنف کی دیگر تصانیف کیا کیا اور کہاں کہاں ہیں اور مرتب نے ان کے حالات کن ماخذ (یا مرتب ہی کے لفظوں میں کن "علیہیات") سے حاصل کئے ہیں اس قسم کی فہرستوں اور ضمیموں سے کام لینا یا ان کو مرتب کرنا ممکن ہے بعض لوگوں کی نگاہوں میں تضیع اوقات و صفحات ہو لیکن انصاف یہ

کہ ان کے ذریعے سے محنت اور وقت کی بچت ہو جاتی ہے اور مہذب ملکوں میں تو بغیر ان امور کے کوئی تصنیف مقبول اور بلند پایہ ہو ہی نہیں سکتی سب سے آخیر میں ایک فرہنگ بھی شامل کردی گئی ہے جس میں قدیم مصنفین کے الفاظ و لغات کا جو اب نامانوس اور متروک ہیں، شافی حل بھی حتی الوسع کیا گیا ہے۔

پھر اسی کے ساتھ شعراء و سلاطین کی سات تصویریں اور وصلی و قطعات کی چار تصویریں بھی شامل کر کے کتاب کی زینت میں اضافہ کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ اردو ادب کے شاہ کاروں کا یہ مجموعہ موسوم بہ "اردو شہ پارے" عرق ریزی اور محنت کا ایک بہترین نتیجہ، اور معلومات و تحقیقات جدیدہ کا ایک اچھا ذخیرہ ہے اور بجائے خود ایک شاہکار لیکن ہم کو بعض مقامات کے طرز بیان پر اعتراض ہے ....

بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب اس دور کی ایک بہترین پیداوار ہے اور ہم جناب زور کو ان کے اس قابل قدر کارنامے پر مبارکباد دیتے ہیں۔

رسالہ نگار (لکھنؤ) اپریل ۱۹۳۰ء کی رائے

ڈاکٹر سید محی الدین قادری جو حال ہی میں لسانیات کی تحقیقات سے فارغ ہو کر ولایت سے واپس آئے ہیں معروف و مقتدر نوجوانان دکن میں سے ہیں اور اردو شہ پاروں کی پہلی جلد انہیں کی تحقیق کا نتیجہ ہے

اس کتاب کے ضمیمے بعض نہایت بیش قیمت معلومات پر مشتمل ہیں۔

……

کتاب ولایتی کھردرے کاغذ پر مجلد شایع کی گئی ہے اور صوری ومعنو
دونوں حیثیت سے عہد حاضر کی بہترین تالیفات میں جگہ پانے کے
قابل ہے ……

ڈاکٹر عبدالستار صدیقی صدر شعبہ عربی و فارسی الہ آ[illegible]
یونیورسٹی کی رائے

مجھے کتاب کو دیکھکر بہت خوشی ہوئی۔ نہایت مسرت کا مقام ہے کہ
باوجود اور مشاغل کے مصنف نے اس کام کے لئے بھی فرصت نکال لی
میری دعا ہے کہ ڈاکٹر سید محی الدین زور ایسی بہت سی مفید کتابیں شایع کر

……

کتاب نہایت خوب ہے اور اردو ادب کی ایک بڑی کمی کو پورا کرتی ہ
امید ہے کہ باقی حصے بھی جلد چھپیں گے۔ ڈاکٹر زور نے اپنے ذمے کا کام
بہت اچھی طرح انجام دیا ہے۔

مصنف کو آپ میری طرف سے مبارک باد دیں کہ انھوں نے محن
اور کاوشں کے ساتھ یہ شہ پارے تلاش اور کاموں میں برکت دے
اور ان کی سود مندی کو روز افزوں ترقی ہو۔